

گفتارِ عاشورا

مرتضیٰ مطہری
محمد بہشتی
ابراہیم آیتی
محمود موسوی

گفتارِ عاشورا

مرتضیٰ مطہری　　ابراہیم آیتی

محمد بہشتی　　محمود موسوی

یکے از مطبوعات

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی-۲

مترجم ———— ایم اے انصاری

مدیر ———— رضا حسین رضوانی

کتابت ———— اشرف راحت

تصحیح ———— کاظم علی گجراتی

طبع اول ———— سنہ ۱۴۰۴ھ - ۱۹۸۴ء

مطبع ———— شاہین پیکیجز کراچی

اسلام

"کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدد ندیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیت اور عبادت کا بلندترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اِسے اعلیٰ احکام، بلند اصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوّق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمھارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو، اس کے معتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اِسے اس کا مناسب مقام دو۔"

امام علی علیہ السلام

کچھ اپنے بارے میں

ایک بیدار مغز شخص، انسان کی فکری زندگی میں ایک عظیم تبدیلی رُونما ہوتے دیکھ سکتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجُودہ دَور کی توجّہ کا رُخ مادّے سے زیادہ رُوح کی جانب ہے اور سائنس داں کائناتی شعور، علتِ اولیٰ، عقلِ کُل اور قادرِ مطلق کے بارے میں سوچنے لگے ہیں۔

ہمیں انسانی ذہن کی مادّے سے روح کی جانب اس منتقلی پر بے انتہا مسرّت ہے کیونکہ یہ انسان کے روحانی ورثے کی پیش رفت کے بارے میں ہمارے مشن سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہے۔ ادارہ اسلامک سیمینری کا بھی بعینہٖ یہی مطمحِ نظر ہے۔ یہ ادارہ اس رُوحانی ہدایت کی شمع کو روشن رکھنے کا متمنّی ہے جو کہ موجُودہ دَور کی ترقّی سے مکمّل طور پر ہم آہنگ ہے۔ یہ قرآنی طرزِ زندگی کو اس کی حقیقی پاکیزگی کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ اسے اس طرزِ خیال کے حامل بہترین اشخاص کی خدمات میسّر ہیں۔ یہ اسلام میں موجود ہر وہ مواد پیش کرتا ہے جو مکمّل طور پر معتبر اور مستند ہے۔ اس کی مطبوعات دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو مدِّ نظر رکھکر مرتّب کی گئی ہیں۔ یہ ایک عالمی ادارہ ہے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کی خاطر اس نے ایشیا، افریقہ، امریکہ، کینیڈا، یورپ اور مشرقِ بعید میں دفاتر قائم کیے ہیں۔

انشاءاللہ ادارہ اسلامک سیمینری علم کا ایک ایسا دوامی چشمۂ فیض ثابت ہوگا جس سے شائقین جی بھر کر اپنی روحانی پیاس بُجھا سکیں گے۔



قارئینِ گرامی!

یہ کتاب ادارۂ جامعہ تعلیماتِ اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ اِس ادارے کی مطبوعات کی تیاری کا مقصد دورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اُجاگر کرنا ہے۔ اِس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اِس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گرانقدر رہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اِس کتاب کا مطالعہ اُسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔ آپ سے یہ استدعا بھی ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آرا، تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اِس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اِس ارشادِ ربّانی کی تعمیل ہو سکے۔

"(اے رسول!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی اور انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو۔"

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار: سیکریٹری نشر و اشاعت

فہرست



پیش لفظ

کربلا اسلام اور انسانیت کے لیے عظیم قربانی اور گرانقدر خدمات کے تسلسل میں اسلامی اقدار کی ایک روشن مثال پیش کرتی ہے۔

امام حسینؓ، ان کے اہلبیت اور اصحاب نے شہادت کی جو نظیر پیش کی ہے وہ عقول انسانی کو بالیدگی اور قلوب انسانی کو ایسی بلند پایہ اقدار فراہم کرتی رہے گی، جو انسان کو انسانیت کے اس بلند مرتبے پر فائز کر دیں، جس کی اللہ تعالےٰ ایک سچے مسلمان سے توقع رکھتا ہے۔

اسلام ایک دائمی تحریک اور دائمی انقلاب کا نام ہے جو نظریاتی میدان میں ایک مکمل نظام ہے ——— اور تاریخی تسلسل کے سفر میں ایک زندہ تحریک ہے۔

نظریاتی طور پر اسلام کے ایک کامل نظام ہونے پر یہ آیۂ شریفہ دلالت کرتی ہے:

"آج ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا، تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کیا۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۳)

تاریخی تحرک کے میدان میں، اسلام کے دائمی تحریک ہونے پر یہ آیۂ شریفہ شاہد ہے:

"تم بہترین امت ہو، جو لوگوں کے لیے بھیجے گئے ہو، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

(سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۱)

"تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۰۴)

چونکہ اسلام کاروانِ تاریخ میں ایک دائمی تحریک اور ایک دائمی انقلاب ہے اس لیے وہ مسلسل قربانیاں پیش کرتا رہتا ہے۔ اس نے اپنی ابتداء سے کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے جاہلیت کی قوتوں اور اقدار کے مقابلے میں شہداء پیش کیے اور تکمیل دین کے بعد تحریف اور تخریب کی قوتوں کے مقابل اپنی مذکورہ کامیابی کی حفاظت کرنے کے لیے بھی مسلسل قربانیاں پیش کرتا رہا۔ ہر انقلاب میں شہداء کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور ہر انقلاب کے مقابلے میں اس انقلاب کی اقدار اور اس کے مقاصد کی مخالفت ابھرتی رہی جس کا ہدف یہ تھا کہ وہ اسے اور اس کے مستقبل کو تہس نہس کر دے۔ یہیں سے انقلاب دشمنی کے خلاف شہادت کی عظمت ابھر کر سامنے آتی ہے کیونکہ یہ ان فاتحین کی شہادت ہے جو

فتح ونصرت کے اعزاز کے اسیر نہیں بنے بلکہ فتح پالینے کے بعد بھی اپنے موقف پر جمے رہے تاکہ شہادت جیسی عظیم نعمت سے سرفراز ہو سکیں۔

امام حسینؑ اسی فاتح گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور وہ فتح کے اعزازات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلامی معاشرے میں پُر آسائش زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دیکھا کہ اسلام دشمن تحریک اسلام ہی کے بھیس میں پروان چڑھ رہی ہے، اسلام فکری جمود کا شکار ہو چکا ہے اور جیسے کہ رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا، اسلامی خلافت، قیصریت، کسرائیت اور جابرانہ شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اسلام جو حسینی تصور میں ایک دائمی انقلاب ہے، جسے ہمیشہ انحرافی تحریک، ملوکیت کے جمود اور تشدد کا ذریعہ بنائے جانے کے خطرات کا سامنا رہا اسی مفہوم کی بنا پر امام حسینؑ نے اپنے لیے شہادت کی راہ کا انتخاب کیا تاکہ اسلام کی روح کی حفاظت ہو سکے اور اسے انحرافی تحریک کی آلودگیوں سے پاک رکھا جا سکے۔

وہ اسلام، جس کی خاطر امام حسینؑ نے شہادت پیش کی، ایک موہوم نظریہ نہیں بلکہ روئے زمین پر نافذ العمل ہونے والا ایک مکمل نظام ہے۔ وہ ایک ایسا مسلم معاشرہ تشکیل دیتا ہے جو لوگوں کی تمام ضرورتوں کی کفالت کرتا ہے، ان کے انسانی شرف کا تحفظ کرتا ہے اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو سنوارتا ہے۔

امام حسینؑ اور ان کے ساتھی صرف قتل ہونے کے بعد ہی نہیں بلکہ زندہ ہوتے ہوئے بھی شہید تھے۔ شہادت فقط موت سے نہیں بلکہ زندگی میں بھی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ کسی عادلانہ موقف پر ڈٹ جانا، ذاتی، خاندانی اور جماعتی خیالات سے بلند

ہو کر پورے معاشرے کی فلاح کی خاطر ایک عادلانہ موقف اختیار کرنا، اسے پوری امت کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کا موقف بنا دینا، تعلیماتِ الٰہیہ کے مطابق اس موقف کا رشتہ خدا سے جوڑنا اور سیاسی نقوش کے اصولوں پر کاربند رہنا ہی زندگی کو شہادت کے معنی پہناتا ہے اور یہی عمل موت کو شہادت کے زیور سے آراستہ کرتا ہے۔

مادی زندگی تو سب لوگوں کے لیے ہے لیکن شہید کا مستقبل انسان کے روحانی ارتقاء کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہی چیز انسان کو شہادت کا امتیازی نشان عطا کرتی ہے اور یہی شہدائے کربلا کے تقریبِ شہادت کی حقیقت ہے۔ یہ شہادت تاریخ کے صحن میں انسانی شرف کے دروازے سے داخل ہوئی ہے، فرقہ واریت، علاقائیت اور قومیت کے راستے سے نہیں۔ انسانیت کے دروازے سے اسلیے داخل ہوئی کہ یہ انسان جیسی صاحبِ شرف مخلوق کے موقف کی ترجمان تھی، وہی انسان جسے شرافت، سعادت اور بہتر مستقبل کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

"ہم نے بنی آدم کو شرف عطا کیا، انہیں بحر و بر پر تسلط بخشا، پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت دی۔" (سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۷۰)

لہٰذا کربلا کی آفاقیت اور اس کی انسانیت ہی ہے جس نے اسے دوام بخشا، اور یہ آج تک لوگوں کے ضمیروں، دعاؤں اور خیالوں میں جاگزیں ہے اور ان کی رہنمائی ان اعلیٰ دینی اقدار کی طرف کرتی ہے جو انسان کو اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکال کر پورے معاشرے کی عزت، سلامتی اور مستقبل کے لیے سعی و عمل کے میدان

میں لا کھڑا کرتی ہے، جیسے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا ہے:

"تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔"

حسینی انقلاب اور ان کی آل و اصحاب کی شہادت کو جب ہم اس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو عالمِ اسلام میں رونما ہونے والے واقعات کی حقیقت کو سمجھ جاتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ اب کہاں پہنچ چکا ہے اور اسے کون سے خطرات درپیش ہیں۔ کربلا میں انسانیت کے نمایاں پہلو کے تحت آج بھی ہر انسان اور ہر جماعت کے لیے ایک کربلا بپا ہے۔ آج انسان ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے کہ یا تو وہ عقیدۂ توحید پر رہتے ہوئے اللہ کے بھروسے پر مشرق و مغرب سے منہ موڑ لے اور اپنے نفس کے خلاف جنگ کر کے تقرب الٰہی کی خاطر مستضعفین کی حمایت کرے، دین کی پاسداری کرے، اخوت، محبت اور وحدت کو اپنا شعار بنائے اور اسلام کو سربلند کرے یا پھر طاغوت کے تابع فرمان ہو جائے۔ ظلم، خیانت، تعصب اور افتراق کا راستا اپنائے۔ بہرحال ہم میں سے ہر ایک اپنی روش کے تعین میں اسی دوراہے پر کھڑا ہے۔

گزشتہ ادوار میں بہت سے لوگ اس دوراہے پر پہنچ کر ناکام ہو گئے لیکن آج اگر ہم ناکام ہو گئے تو یہ ہمارے دینی تشخص کی موت ہو گی کیونکہ مکار دشمن ہماری گھات میں ہے۔

شیخ محمد مہدی شمس الدین
نائب صدر المجلس الاسلامی الشیعی الاعلیٰ
(لبنان)

بجھ گئے تھے ہر روش پہ رشد کے نقشِ قدم
چگ رہا تھا بہترین اوصاف کو بوم درم
خندہ زن تھا قصر کی صولت پہ دولت کا بھرم
پرفشاں تھا خود حرم کے بام پر شاہی علَم

چل پڑا تھا لشکرِ حیوانیت انسان پر
پاؤں رکھا چاہتی تھی خسروی قرآن پر

جوشؔ

(ڈاکٹر ابراہیم آیتی)

جہادِ حسینیؑ کے اسباب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ـ
بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ ـ (سورۃ آل عمران-آیت ۱۶۹)

جیسا کہ آپ نے کل اور آج کے اخبارات میں ملاحظہ فرمایا ہوگا آج کی تقریر کا موضوع، وہ اسباب ہیں جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کو قیام پر مجبور کیا۔ وہ کیا واقعات تھے، جن کی وجہ سے امام حسینؑ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان حالات میں خاموش بیٹھنا گناہ ہے۔ میں گفتگو کے آغاز ہی میں یہ عرض کر دوں کہ یہ واقعات اچانک اور یک بارگی پیش نہیں آگئے تھے۔ یعنی ایسا نہیں ہوا تھا کہ معاویہ بن ابی سفیان کے بعد رجب ۶۰ ہجری میں یکایک اسلامی معاشرے میں ایسی کوئی خاص صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی جس نے امام حسینؑ کو قیام پر مجبور کر دیا اور اس سے پیشتر اسلامی تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے اس صورتِ حال کا مقدمہ اور تمہید قرار دیا جا سکے۔ دراصل بات یہ نہیں ہے بلکہ امام حسینؑ کے قیام کے اسباب کی جستجو کم از کم تیس سال پہلے کی تاریخ میں کرنی چاہیے۔ یہ تو

براہِ راست اسباب کی بات ہے۔ اگر بالواسطہ اسباب کی طرف بھی دھیان دیا جائے تو اس سے بھی پیچھے جانا ہوگا لیکن اس وقت بالواسطہ اسباب کا تذکرہ نہ مقصود نہ اس کا موقع۔ بہر حال ۶۰ھ سے تیس سال پہلے یعنی ۲۹ھ یا ۳۰ھ ہجری میں اس مقدس تحریک کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے، عثمان بن عفان اموی نے تقریباً بارہ سال تک مسلمانوں پر حکومت کی اور اسلامی خلافت ان کے قبضے میں رہی۔ جیسا کہ آپ نے تاریخ میں پڑھا ہے، عثمانی خلافت کے آخری چھ سالوں میں اسلامی حکومت کی صورت بدل گئی تھی۔ اسلامی حکومت میں ہونا یہ چاہیے کہ اور سب معاملات میں تو لوگوں کو مکمل آزادی حاصل ہو، لیکن قاعدہ قانون کی پابندی ہر شخص کے لیے ضروری ہو۔ حق کے حدود اور قانون کی رعایت کے سوا کوئی شخص کسی اور بات کے لیے مجبور نہ ہو حتیٰ کہ خود خلیفہ کی ذاتی اور شخصی خوشی کی رعایت کا بھی کوئی شخص پابند نہ ہو۔ حکومت کی یہی وہ صورت تھی جو بدل گئی تھی۔ مسلمانوں کو قانون کی پابندی سے آزادی مل گئی اور اس کے بجائے ان کے لیے صرف خلیفہ کی خواہشوں اور مصلحتوں کا خیال رکھنا اور ان کا احترام کرنا ہی ضروری رہ گیا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر اسلامی حکومت کی صورت یہ ہو گئی تھی کہ ہر شخص کے لیے یہ لازمی ہو گیا تھا کہ وہ دربارِ خلافت کی مصالح اور خواہشات کے مطابق عمل کرے خواہ اس میں قانون کی خلاف ورزی ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ جو شخص دربارِ خلافت کی خواہش کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا تھا، وہ خواہ حق پر ہی کیوں نہ ہو اور قانون کی کتنی ہی پابندی کیوں نہ کرتا ہو، اس کی گرفت کی جاتی تھی اور اسے سزا کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے عثمانی خلافت میں عمار یاسر رضؓ کو سزا دی گئی، ابوذر غفاری رضؓ پر سختی کی گئی اور انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔ وہ لوگ

جو نہ صرف حق و انصاف کا لحاظ کرتے تھے بلکہ مذہب اور قانون کے نگہبان اور حلال و حرام کا خیال رکھنے والے تھے، اس لیے قید میں ڈالے جاتے اور تکلیف میں مبتلا کیے جاتے تھے کہ وہ خلیفہ اور دربارِ خلافت کے مفاد اور خواہشات کا خیال نہیں رکھتے اور حق و انصاف کی خاطر خود خلیفہ کی ناراضگی کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس جو لوگ دربار کے رجحانات اور خواہشات کا ساتھ دیتے تھے، نہ صرف یہ کہ ان کے اپنے حقوق محفوظ رہتے تھے بلکہ دوسروں کے حقوق بھی ان کی جیب میں چلے جاتے تھے۔ اسلام کی تاریخ میں یہ بات صاف اور عیاں ہے کہ عثمان بن عفان کی خلافت کے آخری چھ سالوں میں ان لوگوں نے جو عوام کے خیال کے مطابق جنتی تھے یتیموں اور بیواؤں کا مال غصب کر کے اس قدر دولت جمع کر لی تھی اور جائیدادیں بنا لی تھیں کہ واقعی حیرت ہوتی ہے۔ جب ان لوگوں کا جو جنتی کہلاتے تھے یہ حال تھا تو پھر دوزخیوں کا جو حال ہوگا وہ ظاہر ہے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، غیر شیعہ ذرائع نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ایک حدیث روایت کی ہے۔ شیعہ اس حدیث کو قطعی دلائل کی بنا پر غلط اور موضوع قرار دیتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں۔ یہ حدیث جو شیعوں کی نظر میں موضوع اور دروغ ہے رسولِ اکرمؐ پر بہتان ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے دس صحابہ کو یہ بشارت دی تھی کہ تم جنتی ہو۔ اب آپ دیکھیے کہ خلافتِ عثمان کے آخری چھ سالوں میں ان جنتیوں نے کیا مصیبت برپا کی، کس طرح املاک اور جائدادیں جمع کیں اور بیچارے عام مسلمانوں کے حقوق اور بیت المال کے اثاثوں میں بے جا تصرف کیا۔ یہ وہی مال تھا جس کی علی بن ابی طالبؑ نے اپنے زمانۂ خلافت میں سخت نگرانی کی تھی، اور عثمان بن عفان سے پہلے دونوں خلفاء نے اور اپنے اوائلِ خلافت میں خود عثمان نے بھی ان کے خرچ میں خاص

احتیاط کو ضروری سمجھا تھا۔ میں نے بطورِ مثال دورِ عثمان میں ان خبتیوں کے کچھ حالات تاریخِ اسلام کے ایک اہم ماخذ سے نوٹ کیے ہیں جو میں آپ کو سناؤں گا تاکہ آپ کو بھی معلوم ہو جائے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ خدانخواستہ جذبات یا مذہبی تعصب پہ مبنی نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ سنہ ۲۹-۳۰ ہجری کے بعد آہستہ آہستہ جو واقعات پیش آئے ہم ان کا جائزہ لیں تاکہ وہ اسباب واضح ہو جائیں جن کی وجہ سے امام حسینؑ کا قیام ضروری ہو گیا تھا اور جن کی بنا پہ انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ حق سے انحراف کی یہ مصیبت جو تئیس سال سے منڈلا رہی تھی اس کا علاج خونی جدوجہد اور شہادت سے سرفرازی کے سوا کچھ نہیں۔ انشاءاللہ میری گفتگو سے یہ مضمون کافی حد تک واضح ہو جائے گا۔

جو لوگ تاریخِ اسلام اور اس کے ابتدائی ماخذ سے واقف ہیں وہ مسعودی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ علی بن الحسین المسعودی ایک معتبر اور قابلِ اعتماد اسلامی مؤرخ اور جغرافیہ داں ہے جس پر پانچوں اسلامی مکاتبِ خیال اعتماد کرتے ہیں۔ اس کی کتاب مروج الذہب دلچسپ، نفیس اور معتبر کتاب ہے۔

خلافت عثمان کے تذکرہ میں مسعودی لکھتا ہے:

جب خلیفہ عثمان بن عفّان قتل ہوئے اور انہوں نے دنیا سے رحلت کی تو ۱۵۰ دینار طلائی اور دس لاکھ درہم نقد چھوڑے۔ عثمان کے بعد علی بن ابی طالبؑ خلیفہ ہوئے۔ جب انہوں نے شہادت پائی تو امام حسنؑ نے منبر سے اعلان کیا کہ میرے والد نے سات سو درہم کے علاوہ ترکے میں سونے چاندی کا کوئی سکہ نہیں چھوڑا۔ یہ سات سو درہم بھی آپ نے اپنی تنخواہ میں سے اس لیے بچاتے تھے کہ ان سے گھر کے کام کاج کے لیے ایک

خادم کا انتظام کیا جا سکے[1] ادھر دیکھیے' ان لاکھوں درہم و دینار کے علاوہ وادی القریٰ اور حنین وغیرہ میں جو جناب عثمان کی جائداد تھی اس کی قیمت ایک لاکھ دینار طلائی تھی۔ اس کے علاوہ گھوڑوں اور اونٹوں کی تو کوئی گنتی ہی نہیں تھی[2] عشرۂ مبشرہ والی حدیث کے مطابق عثمان جنتی تھے۔ حکومتِ اسلامی کی سربراہی سے پیغمبرِ اکرمؐ تو دس روپے بھی جمع نہ کر سکے۔ علیؑ اور ابوبکر و عمر نے بھی اس عہدے سے کوئی مادّی فائدہ نہ اٹھایا۔ عثمان نے البتہ اس سے خاصا فائدہ اٹھایا۔

یہی مسعودی لکھتا ہے کہ زبیر بن العوام نے ایک مشہور محل بصرہ میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کے علاوہ بصرہ، کوفہ اور اسکندریہ (مصر) میں ان کے اور بھی بہت سے مکانات تھے۔ اس حدیث کے مطابق اور میرے الفاظ میں یہ زبیر بھی جنتی تھے۔ زبیر کا ترکہ پچاس ہزار دینار طلائی' ایک ہزار گھوڑے' ایک ہزار غلام اور کنیزیں اور مختلف شہروں میں کثیر غیر منقولہ جائداد پر مشتمل تھا۔ یہ قطعی بات ہے کہ اتنی دولت حلال اور طیب ذرائع سے فراہم نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس دولت کا بڑا حصہ ان محروم لوگوں کا حق تھا جو حکومت کے زیرِ عتاب تھے۔ چنانچہ ان کا حصہ بھی یہ لوگ سمیٹتے چلے گئے۔

مسعودی مزید لکھتا ہے کہ طلحہ بن عبید اللہ تیمی نے جو ایک اور جنتی تھے

---

[1] مروج الذہب مطبوعہ مصر ۱۹۴۸ء جلد ۲۔ صفحہ ۴۲۶۔ ایک روایت ہے کہ امام علیؑ نے اپنے خاندان کے لیے میراث میں ۲۵۰ درہم، قرآن اور تلوار چھوڑی۔

[2] مروج الذہب۔ جلد ۲۔ صفحہ ۳۴۱۔

کوفہ میں ایک مشہور محل بنوایا۔ غور سے سنیے:

مسعودی کہتا ہے کہ طلحہ بن عبیداللہ تیمی کی آمدنی صرف عراق کی جائداد سے ایک ہزار دینار طلائی تھی، بلکہ ایک روایت کے مطابق تو اس سے بھی زیادہ۔ شراۃ کے علاقے کی آمدنی اس سے بھی زیادہ تھی۔ طلحہ نے مدینہ میں اپنا مکان پختہ اینٹوں، چونے اور بیش قیمت لکڑیوں سے بنایا تھا۔

مسعودی آگے لکھتا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف زہری نے جو ایک اور جنتی تھے، ایک وسیع مکان بنایا تھا۔ ان کے اصطبل میں سو گھوڑے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ایک ہزار اونٹ اور دس ہزار بھیڑ بکریاں تھیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جب انہوں نے دنیا سے رحلت کی، ان کے ہاں چار بیویاں تھیں۔ اگر مرنے والے کے اولاد ہو تو اس کے مال کا آٹھواں حصہ اس کی بیوی یا بیویوں کو ملتا ہے۔ ایک بیوی ہو جب بھی آٹھواں حصہ اور اگر چار بیویاں ہوں جب بھی آٹھواں حصہ۔ عبدالرحمٰن بن عوف کی چار بیویاں تھیں۔ اس لیے ایک بیوی کا حصہ ۲ ۳۲/۱ تھا۔ اس ۳۲/۱ کے حساب سے ان کی ہر بیوی کو ۸۴ ہزار دینار طلائی ملے۔ سنا آپ نے! یہ بھی ایک جنتی تھے۔

سعد بن ابی وقاص بھی جنتی تھے۔ مسعودی لکھتا ہے کہ انہوں نے ایک سر بفلک محل بنوایا تھا۔ یہ "سر بفلک" تو میں نے کہا ہے۔ مسعودی کے الفاظ ہیں "بلند اور شاندار محل"۔

زید بن ثابت البتہ ان جنتیوں میں شامل نہیں ہیں لیکن انہوں نے بھی اپنے انتقال کے وقت اس قدر سونا چھوڑا تھا کہ ورثاء میں تقسیم کرنے کے لیے ہتھوڑوں سے توڑنا پڑا۔ ان کی باقی منقولہ و غیر منقولہ جائداد کی قیمت ایک لاکھ

دینار تھی۔

مسعودی آگے لکھتا ہے: یعلیٰ بن امیہ جن کو یعلیٰ بن منیہ بھی کہا جاتا ہے۔ منیہ ان کی ماں کا نام تھا اور امیہ باپ کا۔ یہ صاحب عثمانی دورِ خلافت میں اہم سیاسی اور انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ آج کل کی اصطلاح میں وزیرِ مال تھے۔ یہ بھی میری اپنی تعبیر ہے۔ مسعودی لکھتا ہے کہ یعلیٰ بن امیہ نے مرتے وقت پانچ لاکھ دینار طلائی چھوڑے۔ اس کے علاوہ لوگوں پر ان کا کثیر قرضہ بھی تھا۔ ان کی جائداد اور دوسرے ترکہ کی قیمت تین لاکھ دینار تھی۔

اس کے بعد مسعودی کہتا ہے: یہ بات عمر بن خطاب کے دور میں نہیں تھی بلکہ اس وقت کا طریقہ صاف اور واضح تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں اور آپ شیعہ ہیں۔ تاہم سچی بات یہی ہے اور مسعودی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے حکومت سے وفاداری کی صورت میں قانون کی یہ کھلے بندوں اور بے روک ٹوک خلاف ورزی کی اس حد تک اجازت دورِ عثمانی ہی میں شروع ہوئی۔ اگر کوئی شخص دربار کی خوشنودی حاصل کر لیتا تھا، تو پھر قانون شکنی اور حدود سے تجاوز میں اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ غرض مسعودی کہتا ہے کہ عمر کے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ یعنی طرزِ حکومت اور جمع و تقسیم اموال کا طریقہ ایسا تھا کہ طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور دوسروں کی مجال نہیں تھی کہ مسلمانوں کے اموال پر قبضہ کر کے اس قدر کثیر دولت جمع کر لیتے۔[1]

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے عثمان کے قتل کے بعد خلافت امیر المومنین امام علی علیہ السلام کو ملی۔ علیؑ کے سامنے جو مشکل تھی وہ یہی تھی کہ لالچ، طمع اور

---

[1] مروج الذہب جلد ۲۔ صفحہ ۳۴۲، ۳۴۳۔

ان بری عادتوں پر جو پیدا ہو چکی تھیں کیسے روک لگائی جائے۔ علیؑ اپنی خلافت کے چار سال اور چھ ماہ کے دوران میں اسی مشکل کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کا مقابلہ ان ہی لوگوں سے تھا جو یہ چاہتے تھے کہ علیؑ کی خلافت میں بھی پہلے کی طرح دولت جمع کرتے رہیں۔ علیؑ کہتے تھے کہ یہ ناممکن ہے بلکہ اس سے پہلے تم نے جو مال بیجا طور پر اکٹھا کر لیا ہے ہیں وہ تم سے واپس لے کر اسلامی بیت المال کو دے دوں گا۔ اسی قضیہ میں بالآخر علی بن ابی طالب کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، امام علیؑ کے بعد خلافت امام حسنؑ کو منتقل ہوئی اور امام حسنؑ اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ امام حسنؑ کے زمانے میں مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی حالت نے ایک خاص شکل اختیار کر لی تھی۔ اس وقت اگر امام حسنؑ معاویہ بن ابی سفیان سے جنگ جاری رکھتے تو کسی فریق کی جلد کامیابی کی امید نہیں تھی کیونکہ مسلمانوں کی طاقت دونوں محاذوں پر تقریباً برابر برابر بٹی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں حسنؑ بن علیؑ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بے نتیجہ خوں ریزی سے بچنے کے لیے جنگ سے دست کش ہو جائیں۔ اس بے نتیجہ خوں ریزی کا فائدہ صرف مشرقی رومی سلطنت کو یا اندرونی طور پر خوارج کو پہنچ سکتا تھا۔ اگر معاویہ بن ابی سفیان سے جنگ جاری رکھ کر چار پانچ لاکھ مسلمان جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تو خدا ہی جانتا ہے پھر اس کے بعد مشرقی رومی سلطنت سے لڑائی میں مسلمانوں پر کیا گزرتی۔ خوارج کا خطرہ کیا صورت اختیار کرتا اور بعد میں اسلامی تاریخ کیا ہوتی۔ یہ میری اپنی توجیہہ ہے۔ آپ بھی اس پر غور کیجیے۔ اس وقت موضوعِ سخن یہ بحث نہیں ہے اس لیے میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ غرض امام حسنؑ خلافت سے

کنارہ کش ہو گئے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے معاویہ کی اطاعت قبول کر لی تھی اور معاویہ کو خلیفہ اور امیر المومنین تسلیم کر لیا تھا۔ امام حسنؑ اور معاویہ کے درمیان جو صلح نامہ ہوا تھا اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ امام حسنؑ معاویہ سے صلح کرتے ہیں اور علیحدگی اختیار کرتے ہیں اس شرط پر کہ حسن بن علیؑ معاویہ کو ہرگز امیر المومنین نہیں کہیں گے۔ یعنی وہ معاویہ کو مسلمانوں کا خلیفہ اور امیر المومنین تسلیم نہیں کرتے۔ میں اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ میری نظر میں یہ معاملہ ایک قطعی دلیل ہے ان لوگوں کے خلاف جو یہ سمجھتے ہیں کہ امام حسنؑ نے معاویہ کی اطاعت قبول کر لی تھی، معاویہ کو مسلمانوں کا خلیفہ مان لیا تھا اور امام حسنؑ بھی معاویہ کی فرماں بردار رعایا میں داخل ہو گئے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس قضیہ کے متعلق ابن اثیر کی کامل التواریخ سے ایک اقتباس نوٹ کیا ہے۔ آپ بھی سنیے۔ ابن اثیر کامل التواریخ اور اُسد الغابہ فی معرفتہ الصحابہ کا مصنف ہے۔ یہ دونوں کتابیں قابلِ قدر اسلامی تصانیف ہیں۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ جب حسنؑ بن علیؑ نے علیحدگی اختیار کر لی اور معاویہ نے خلیفہ ہو کر معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تو فروہ بن نوفل اشجعی خارجی نے ــــ جو اس سے قبل اپنے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ الگ ہو کر شہر زور چلا گیا تھا ــــ کہا کہ اب اس میں شک نہیں رہا کہ حکومتِ وقت سے جنگ کرنا ضروری ہو گیا۔ معاویہ کے برسرِ اقتدار آنے اور خلیفہ بن جانے کے بعد جنگ ہمارے اوپر واجب ہو گئی۔ اس پر ان لوگوں نے عراق کا رخ کیا اور کوفہ کے نخلستان تک پہنچ گئے۔ امام حسنؑ اس وقت عراق چھوڑ کر مدینہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ جب معاویہ کو خبر ملی کہ یہ خارجی اپنے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ سرکشی اور بغاوت پہ آمادہ ہے تو اس نے حسنؑ بن علیؑ کے ساتھ صلح کو مزید مستحکم کرنے کے لیے (بخیال خویش) امام حسنؑ کے نام ایک

فرمان جاری کیا۔ یہ چٹھی اس وقت لکھی گئی جب امام حسنؑ عراق اور حجاز کے درمیان راستے میں تھے۔ معاویہ نے حسنؑ بن علیؑ کو ہدایت کی کہ فروہ بن نوفل خارجی اپنے پانچ سو ہمراہیوں کے ساتھ کوفے کی طرف بڑھ رہا ہے لٰہذا تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ تم وہاں جاکر اس کا مقابلہ کرو اور اس سے کوفہ کا بچاؤ کرو۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ مدینہ روانہ ہو جاؤ۔ جب معاویہ کا یہ خط امام کو ملا اس وقت وہ قادسیہ میں تھے۔ امام حسنؑ نے اس کے جواب میں ایک جرأت مندانہ خط معاویہ کو لکھا جس کے الفاظ حیرت انگیز ہیں۔ آپ نے لکھا کہ: لوْ اٰثرتُ ان اقاتل احدًا من اهل القبلة لبدأتُ بقتالك فانّی ترکتك لصلاح الامة وحقن دمائها۔ (اگر میں اہلِ قبلہ میں سے کسی سے جنگ کرنا چاہتا تو سب سے پہلے تم سے جنگ کرتا۔ میں نے تو تمہیں امت کی بھلائی اور اسے خونریزی سے بچانے کے لیے چھوڑ دیا)۔

اے معاویہ تُو چاہتا ہے کہ حسنؑ ابن علیؑ تیرے ایک افسر کی حیثیت سے ایک خارجی کی سرکشی کو روکے۔ میں مسلمانوں کے مفاد میں خلافت سے دستبردار ہوا ہوں۔ اگر میں یہ چاہتا کہ اہلِ قبلہ یا بظاہر کسی مسلمان سے جنگ کروں تو پہلے تجھ سے جنگ کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ تو سب مسلمانوں سے بدتر ہے۔ فانّی ترکتك لصلاح الامة وحقن دِمائها ــــ ترکتُك کے لفظ پر غور کیجیے۔ فرمایا: فانّی ترکتُك لصلاح الامّةِ وحقن دمائِها۔ یعنی میں نے تجھے چھوڑ دیا اور تجھ سے جنگ نہیں کی۔ مطلب وہی ہے جو میں نے عرض کیا اور یہی مطلب یہاں میری نظر میں بہترین ہے۔ یعنی میں دستبردار ہو گیا اور تجھے چھوڑ دیا امت کی بھلائی کے لیے اور امت کو خونریزی سے بچانے کے لیے۔ اس کی وجہ یہ تھی، جیسا کہ میں نے عرض کیا

کہ جنگ سے کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ فریقین کی اسلامی فوجیں جو طاقت میں برابر تھیں اگر ایک دوسرے سے بھڑ کر ایک دوسرے کو قتل اور کمزور کرتیں تو دونوں نابود ہو جاتیں۔ اس صورتِ حال سے صرف دشمن ہی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ یہی امام حسنؑ نے معاویہ کو لکھا تھا۔[1]

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ امام حسنؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ اس دس سال کی مدت میں جب ابھی معاویہ زندہ تھے یعنی سنہ ۵۰-۴۹ھ سے لیکر سنہ ۶۰ھ تک خاموش بیٹھے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس مدت میں امام حسینؑ نے معاویہ کے خلاف اس طرح تلوار اٹھانا ضروری نہیں سمجھا جس طرح یزید کے خلاف ضروری سمجھا لیکن وہ معاویہ کی غلطیوں کی نشاندہی اور ان پر نکتہ چینی ضرور کرتے رہے جیسا کہ ان کے بھائی امام حسنؑ نے ان فقروں میں جو آپ نے ابھی سنے ہیں خلافتِ معاویہ کی حقانیت کا ابطال کیا تھا۔ سیدالشہداءؑ نے بھی یہی کام کیا۔ اب ایک دو فقرے آپ کو ابن قتیبہ دینوری کے سناتا ہوں۔ ابن قتیبہ سربرآوردہ علمائے اسلام میں سے ہیں اور قطعی طور پر سنی المذہب ہیں، شیعہ نہیں ہیں۔ ابن قتیبہ اپنی مشہور کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں لکھتے ہیں : یہ وہ خط ہے جو امام حسینؑ نے معاویہ کو لکھا۔ میں اس خط کے چند جملے عرض کرتا ہوں تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ حسینؑ بن علی علیہ السلام کی روش معاویہ کے بارے میں کیا تھی اور کیا امام حسینؑ واقعی معاویہ کو ایک خلیفہ اور ایک قابلِ احترام اسلامی سربراہ تسلیم کرتے تھے ؟ کیا اس دس سال کی مدت میں آپ نے واقعی معاویہ کی خلافت، حکومت اور سربراہی کو مان لیا تھا یا حقیقت وہ ہے جو ابن قتیبہ لکھتا ہے۔ اب میں اس خط کے چند فقرے

---

[1] اکامل جلد سوم صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ مطبع منیریہ مصر۔

نقل کرتا ہوں۔ امام حسینؑ معاویہ کو لکھتے ہیں: الست قاتل حجر واصحابه العابدین المخبتین الذین کانوا یستفظعون البدع ویامرون بالمعروف وینهون عن المنکر۔ کیا تم نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو جو عابد و زاہد تھے، بدعات سے متنفر تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے، قتل نہیں کیا؟ تم نے عہد و پیمان کرنے کے بعد از راہِ ظلم ان کو مروا ڈالا حالانکہ اس سے قبل تم نے ان کو امان دی تھی۔ یہ کام خدا کے حکم کے خلاف جرأت اور اس سے کیے ہوتے عہد کی خلاف ورزی تھی۔ کیا تم نے عمرو بن الحمق کو جو ایک بزرگ صحابی تھے قتل نہیں کیا؟ عمرو بن الحمق وہ شخص تھے جن کے بدن کو عبادت نے گھلا دیا تھا۔ تم نے ان کو امان دینے اور ان سے ایسے عہد و پیمان کرنے کے بعد ان کو قتل کیا، کہ ایسا عہد و پیمان اگر آہوانِ صحرا سے بھی کیا جاتا تو وہ بھی پہاڑوں سے اتر آتے۔ کیا تم نے بناوٹی دعویٰ کرنے والے زیاد کو ابوسفیان کا بیٹا قرار نہیں دیا۔ حالانکہ رسول اللہؐ کا فیصلہ تھا کہ بچہ اس کا ہوتا ہے جس کے ہاں پیدا ہو اور زانی کی سزا یہ ہے کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔ پھر تم نے زیاد کو اہلِ اسلام پر مسلط کر دیا تاکہ وہ انہیں قتل کرے، ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے اور ان کو کھجور کے درختوں پر لٹکا کر پھانسی دے۔ سبحان اللہ! معاویہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ تمہارا اس امت سے کوئی تعلق ہے اور نہ اس امت کا تم سے۔ معاویہ خدا سے ڈرو اور یہ سمجھ لو کہ اللہ کے پاس ایک کتاب ہے جس میں ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی ہے۔ معاویہ اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا اس کو فراموش نہیں کر سکتا کہ تم محض بدگمانی سے ہی لوگوں پر اتہام لگاتے اور انہیں ناحق قتل کرتے ہو۔ اس سے بڑھ کر تم نے ایک نادان اور ناتجربہ کار لڑکے کو امیر بنا دیا ہے جو شراب پیتا ہے اور کتوں سے کھیلتا ہے۔ میرے خیال

میں تم نے اپنے آپ کو غارت کر لیا ہے، اپنے دین کو کھو دیا ہے اور رعایا کو تباہ کر دیا ہے۔ والسلام۔ (الامامۃ والسیاسۃ جلد اول صفحہ ۱۹۰ تالیف ابن قتیبہ عبداللہ بن مسلم متوفی ۲۸۷ھ مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ)

یہ تھا حسن بن علی اور حسین بن علی علیہما السلام کا معاویہ بن ابی سفیان سے طرز تخاطب اور ان کی حکومت اور سربراہی پر نکتہ چینی کا طریقہ۔ سید الشہداءؑ کے اس آخری فقرہ کی مزید وضاحت کے لیے جو انہوں نے یزید کے بارے میں لکھا اور جس کا اسلام اور تاریخ اسلام پر نہایت گہرا اثر پڑا ہے علی بن الحسین مسعودی کا ایک اور فقرہ سنیے۔ وہ یزید کے متعلق کہتا ہے: وكان يزيد صاحب طرب وجوارح وكلاب وقرود وفهود ومنادمة على الشراب، و جلس ذات يومٍ على شرابه وعن يمينه ابن زياد وذلك بعد قتل الحسين، فاقبل على ساقيه فقال۔ یزید عیش پسند تھا۔ اس کے پاس شکاری جانور کتے، بندر اور چیتے تھے۔ اس کے یہاں شراب کی محفلیں جمتی تھیں۔ قتلِ حسین کے بعد ایک دن شراب کا دور چل رہا تھا۔ ابن زیاد یزید کی داہنی طرف بیٹھا ہوا تھا۔ یزید نے ساقی کو مخاطب کر کے کہا:

اسقني شربةً تروي مشاشي
ثمّ مل فاسق مثلها ابنَ زيادِ
صاحبَ السرّ والامانة عندي
ولتسديد مغنمي وجهادي

ساقی مجھے ایسا جامِ شراب پلا جو میری طبیعت کو سیراب کر دے
پھر ایسا ہی ایک جام ابن زیاد کو دے جو میرا ہمراز اور معتمد ہے
اور جو میری کامیابیوں اور کوششوں کو مستحکم کرتا ہے۔

اس کے بعد مسعودی یزید کے ظلم و ستم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے[1] کہ وہ رعایا میں فرعون کے مثل تھا۔ پھر کہتا ہے: بل کان فرعون اعدل منہ فی رعیتہٖ وانصف منہ لخاصتہٖ وعامتہٖ بلکہ فرعون یزید سے زیادہ اپنی رعایا کے ساتھ انصاف کرتا تھا اور عوام و خواص کے ساتھ اس سے بڑھ کر انصاف پسند تھا۔ مطلب یہ کہ فرعون اس سے بہتر تھا۔ اس کے بعد مسعودی کہتا ہے کہ یزید کی زیادتیوں، بے باکیوں اور بے دینی سے عامۃ المسلمین بھی متاثر ہونے لگے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بفحوائے الناس علیٰ دینِ ملوکھم جو گناہ یزید کرتا تھا وہی اس کے اکثر ارکانِ دولت کرتے تھے۔ وفی ایامہٖ ظھر الغناء بمکۃ والمدینۃ۔ اسی کے زمانے میں مکے اور مدینے میں گانے بجانے کا رواج ہوا۔ جب ارکانِ دولت اور خود خلیفہ نے گناہ کی راہ اختیار کر لی تو عوام بھی اسی راستے پر چل نکلے۔ مکے اور مدینے میں لوگوں کو گانے اور گانا سننے کی عادت پڑ گئی۔ واستعملت الملاھی لہو ولعب کا سامان استعمال ہونے لگا۔ واظھر الناس شرب الشراب۔ لوگ علی الاعلان شراب پینے لگے کیونکہ خود خلیفہ شراب نوش تھا۔ وکان لہٗ قرد۔ اس کے پاس ایک بندر تھا یعنی اس شخص کے پاس جو خلیفۃ المسلمین کہلاتا تھا۔ مسعودی کہتا ہے کہ یزید کے پاس ایک بندر تھا جس کی کنیت ابو قبیس تھی۔ اس بندر کو شراب نوشی کی محفل میں لایا جاتا اور طشت میں اس کے لیے شراب ڈالی جاتی۔ یہ بندر بہت خبیث تھا۔ اس کو ایک سدھائی ہوئی جنگلی گدھی پر سوار کر دیا جاتا جو گھڑ دوڑ میں حصہ لیتی۔ گدھی پر زین کس دی جاتی اور لگام بندر

---

[1] مروج الذہب۔ جلد ۳۔ صفحہ ۷۷-۷۸

کے ہاتھ میں دیدی جاتی اور اس طرح ابوقیس کی گدھی دوڑ میں شریک ہوتی۔ کبھی کبھی یہ بندر دوڑ جیت جاتا۔ ابوقیس کو سرخ اور زرد ریشم کی قبا اور جامہ پہنایا جاتا۔ قبا کا دامن اس کی کمر سے باندھ دیا جاتا۔ اس کے سر پر رنگین ریشمی ٹوپی رکھی جاتی۔ گدھی کو بھی پھولدار رنگ برنگے کپڑوں سے آراستہ و پیراستہ کیا جاتا۔ یہ ہے تفصیل اس جملے کی جو سیدالشہداءؑ نے معاویہ کے نام اپنے خط میں یزید کے متعلق لکھا تھا۔

معاویہ کا انتقال ماہِ رجب ۶۰ھ میں ہوا اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یزید ان کا جانشین ہوا۔ میں نے کسی کتاب میں ایک عجیب فقرہ دیکھا، لکھا تھا کہ حسینؑ بن علیؑ نے شہادت کیوں قبول کی اور یزید کی بیعت کیوں نہ کرلی۔ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ امام حسینؑ نے دیکھا کہ اگر وہ یزید کی بیعت کرلیں جب بھی قتل کردیے جائیں گے اور نہ کریں جب بھی لہٰذا انہوں نے سوچا جب قتل ہی ہونا ہے تو کیوں نہ آبرومندانہ طریقے سے راہِ خدا میں جان دوں۔ یہ عجیب قسم کا بیان بالکل بے بنیاد ہے۔ سیدالشہداءؑ کی شہادت کا معاملہ اس سے بہت بلند ہے کہ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ تیل تو گر ہی گیا ہے، کہدیا کہ حضرت عباسؑ کی نذر ہے۔ جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ہر حال میں مارے ہی جانا ہے تو کہا عزت کے ساتھ کیوں نہ قتل ہو جاؤں۔ اسلام کی خاطر شہادت کا شرف کیوں نہ حاصل کرلوں۔ یہ بات درست نہیں بلکہ حسین بن علی علیہ السلام نے ان حالات اور واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو کم از کم پچھلے تیس سال سے پیش آرہے تھے یہ طے کیا تھا کہ حکومت اور مسلمانوں کا دین سے انحراف اس قدر شدید ہو گیا ہے کہ اس کا علاج وعظ و نصیحت اور تقریر کرنے یا کتابیں اور رسالے لکھنے سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ شدید انحراف ان طریقوں سے قابلِ اصلاح

نہیں۔ معمولی اور خصوصاً انفرادی انحراف کا علاج تو مختصر تحریک، مختصر اقدام اور مختصر کوشش سے کیا جا سکتا ہے اور بھٹکے ہوئے کو راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے لیکن اگر انحراف شدید اور غیر معمولی ہو، اس کا ملتِ اسلامی کے بنیادی مسائل سے تعلق ہو اور خاص طور پر اگر وہ پھیل کر عام ہو جائے تو کسی معمولی تحریک یا عام تحریر و تقریر سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ امام حسینؑ نے پورا اندازہ لگا لیا تھا کہ اب تک امیر المومنینؑ اور امام حسنؑ نے جو اقدامات کیے ہیں ان کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک تند و تیز قیام اور غیر معمولی خونی تحریک کو بروئے کار لایا جائے کیونکہ اس کے بغیر معاویہ اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی کارروائی کا توڑ کرنا ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے خود امام حسینؑ اپنے قیام کے اسباب جس طریقے سے بیان کر سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

میں نے امام حسینؑ کی تحریروں اور تقریروں سے مجموعی طور پر اور خصوصاً ان کی ترتیب سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سید الشہداؑ نے اپنی تحریک کی ابتداء میں اپنے اقدام کے اسباب اور اپنی تحریک کی روح سے واقف کرانا شروع کیا۔ میں نے امام حسینؑ کی بعض تحریروں اور تقریروں کے اقتباسات نوٹ کیے ہیں جو میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس وصیت نامہ سے لے کر جو آپ نے مدینہ طیبہ میں اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو لکھ کر دیا تھا اس آخری اور صاف اور غیر مبہم خطبے تک جو منزلِ "بیضہ" میں آپ نے حُر بن یزید ریاحی اور ان کے ساتھیوں کے سامنے پڑھا تھا جو میں انشاء اللہ آپ کو سناؤں گا، امام حسینؑ نے مسلمانوں پر واضح کر دیا تھا کہ اولاً حکومتِ اسلامی نے جو کج روی اختیار کی ہے اور ثانیاً مسلمانوں کے تمام اجتماعی معاملات میں جو رخنہ پیدا ہو گیا ہے اس کا علاج شہادت، جانبازی اور تند و تیز قیام کے بغیر ممکن نہیں علامہ مجلسی

نے بحارالانوار کی جلد دہم میں مقتلِ محمد بن ابی طالب موسوی سے ایک روایت نقل کی ہے۔ محمد بن ابی طالب علمائے امامیہ میں سے ہیں۔ یہ روایت ممکن ہے اور کتابوں میں بھی ہو۔ اس روایت میں کہا گیا ہے کہ جب مدینہ کے گورنر نے امام حسینؑ پر یزید کی بیعت کے لیے دباؤ ڈالا تو آپ اس رات میں خاتم الانبیاءؐ کے مزار پر مسلسل تشریف لے جاتے رہے۔ وہاں نماز پڑھی، دعا کی اور شاید وہیں سو گئے۔ دوسری رات میں بھی وہاں جا کر آپ نے چند رکعت نماز پڑھی اور پھر آپ نے یہ فقرے کہے جن میں آپ نے اپنے قیام کے اسباب کی طرف اشارہ کیا: اللّٰھمّ ھذا قبرُ نبیّك۔ الٰہی یہ تیرے نبی کی قبر ہے وأنا ابنُ بنتِ نبیّك اور میں تیرے نبیؐ کا نواسا ہوں وقد حضرنی مِن الامر ما قد علمتَ۔ جو صورتِ حال مجھے پیش آئی ہے تجھے معلوم ہے۔ یہ آخری جملہ اس کتاب میں ہے جس کا میں نے نام نہیں لیا اور نام لینے کی ضرورت بھی نہیں۔ ظاہر ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ یہ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں اور میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ قتل کے لیے تیار ہو جاؤں مگر میں خود سے قتل پر رضامند نہیں ہوں لیکن میں ہرگز یہ پسند نہیں کروں گا کہ کوئی مسلمان اس جملے کا مطلب یہ سمجھ لے کہ امام حسینؑ راہِ خدا میں شہادت کا خطرہ محسوس کر کے نالہ و فریاد کر رہے تھے اور نبیؐ کی قبر پر مایوسی اور کمزوری کا اظہار کر رہے تھے۔

مسلمانو! عمرو بن جموح ایک مسلمان تھا جو پہلے بت پرست اور مدینے کے ایک بت خانے کا کلید بردار تھا۔ یہ شخص سالہا سال بت پرستی میں گزارنے کے بعد بڑھاپے میں مسلمان ہوا تھا۔ جب یہ مسلمان ہو گیا تو اس نے اس درجہ روحانی ترقی کی کہ جب جنگِ احد کے لیے نکلا تو اس نے دعا کے لیے ہاتھ

اٹھا کر کہا: اللّٰھمّ ارزقنی الشھادۃ۔ خدایا! مجھے شہادت نصیب کر۔ اللّٰھمّ لا تردّنی الی اھلی خائباً۔[1] الٰہی ایسا نہ ہو کہ میں اس سفر سے زندہ ناکام واپس آجاؤں۔ جب ایک مسلمان جس کی ساری عمر بت پرستی میں گزری تھی اسلام اس کی روح کو اس قدر بلندی عطا کر دیتا ہے کہ وہ میدان جہاد سے اپنے بیوی بچوں کے پاس زندہ و سلامت واپس آنے کو ناکامی اور محرومی سمجھتا ہے تو پھر اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ امام حسینؑ اپنے نانا کا دامن پکڑ کے فریاد کریں اور یہ کہیں کہ یا رسول اللہؐ اللہ مجھے بچائیے۔ لوگ مجھے مارے ڈالتے ہیں۔ یہ معنی ہرگز نہیں۔ وقد حضرنی من الامر ماقد علمت وہ پیغمبر کی قبر پر کہتے ہیں کہ یا الٰہی جس صورتِ حال کا مجھے سامنا ہے، تجھے معلوم ہے وہ صورتِ حال وہی تھی جس کا امام حسینؑ نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ صورتِ حال وہ افسوسناک کجروی تھی جس سے اسلامی معاشرہ دوچار تھا۔ اس کجروی کا عمیق مطالعہ کرنے اور حکومت اور اس کے نظام کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لینے کے بعد امام حسینؑ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قیام، تحریک اور شہادت کے بغیر اسلامی معاشرے کو اس خطرے اور اس شدید انحراف سے نجات نہیں دلائی جا سکتی۔ اس کے بعد امام نے کہا: اللّٰھمّ انّی اُحبُّ المعروف وانکر المُنکَرَ اس فقرے میں امام مطلب سے زیادہ قریب آجاتے ہیں۔ مگر اب بھی یہ صورت ہے کہ عام لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ "اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نیک کاموں کو پسند کرتا ہوں اور برائیاں مجھے ناپسند ہیں"۔ وانا اسئلکَ یاذا الجلالِ والاکرامِ بحقّ القبر ومن فیہ الاّ

---

[1] سیرت رسول اللہ، الاستیعاب، اسد الغابہ، الاصابہ

اخترتَ لی ماھو لك رضیً ولرسولك رضیً - "اے ذوالجلال والاکرام میری تجھ سے التجا ہے کہ اس مقدس قبر اور صاحب قبر کے طفیل میں جو حالات تو نے میرے لیے پسند کیے ہیں ان کو اپنی اور اپنے رسول خاتم الانبیاءؐ کی خوشنودی کا ذریعہ بنا۔"

یہاں تک سید الشہداءؑ نے اتنا ہی ظاہر کیا تھا کہ میرے قیام کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے آپ کی مراد کیا تھی؟ شاید بعض لوگ آپ کا وصیت نامہ دیکھ کر یا یہ فقرے سن کر یہ خیال کریں کہ امام حسینؑ یہ چاہتے تھے کہ کوفہ جا کر وہاں کے اہل حرفہ اور نانبائیوں سے یہ کہیں کہ کم مت تولو، کوفہ کے تاجروں سے کہیں کہ سود مت کھاؤ۔ یہ تو ہوئی نہی عن المنکر۔ کوفہ کے جوانوں سے یہ کہیں کہ نمازوں سے غفلت مت کرو۔ یہ ہوا امر بالمعروف۔ دراصل بات اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس طرح کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو کوفہ کے واعظ بھی کر سکتے تھے۔ ابھی تک سید الشہداءؑ نے اپنا مقصد پوری طرح واضح نہیں کیا۔ بحار جلد دہم میں مقتلِ محمد بن ابی طالب موسوی سے منقول ہے کہ جب سید الشہداءؑ مدینہ سے روانہ ہونے لگے تو آپ نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام یہ وصیت نامہ لکھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ هٰذا ما اوصٰی به الحسینُ بن علیٍّ ابنِ ابی طالبٍ الی اخیه محمّد المعروف بابن الحنفیه - "یہ وصیت ہے حُسین بن علی کی اپنے بھائی محمد معروف بہ ابن حنفیہ کے نام۔"

مگر حسینؑ بن علیؑ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ انّ الحُسین یشهَدُ ان لآ اله الّا اللهُ وحدهٗ لاشریکَ لهٗ۔ حسینؑ بن علیؑ گواہی دیتا ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وانّ محمّدًا صلی اللہُ

علیه و آلہٖ عبدہٗ ورسولہٗ جاء بالحق من عند الحق۔ اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں جو خدا تے برحق کے پاس سے دین برحق لائے ہیں، وانّ الجنّۃ حقّ والنار حقّ وانّ السّاعۃ اٰتیۃٌ لاریب فیھا وانّ اللہ یبعث من فی القبور۔ "جنت حق ہے اور جہنم بھی حق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامت آنے والی ہے۔ اس روز اللہ تعالیٰ مُردوں کو قبروں سے نکال کر زندہ کرے گا اور ان کا حساب کتاب ہوگا۔"

اس کے بعد اصل مطلب کی بات آتی ہے۔ وانی لم اخرج اشرًا ولا بطرًا ولا مفسدًا ولا ظالمًا۔ میرا قیام اور خروج معمولی نہیں۔ میری تحریک خواہش نفسانی پر مبنی نہیں اور نہ میرا ارادہ کسی پر ظلم کا ہے۔ وانّما خرجتُ لطلب الاصلاح فی امۃ جدّی صلی اللہ علیہ و آلہٖ۔ اس فقرے میں مزید صراحت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے جا رہا ہوں۔ اس فقرے میں حسینؑ ابن علیؑ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ایک خطرناک بگاڑ پیدا ہو گیا ہے جس کی اصلاح "قیام اور خون بہائے بغیر ممکن نہیں۔ فساد ایسا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کے سوا کوئی اس کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ کجی اس قدر شدید ہو گئی ہے کہ اس کا مداوا محض تقریروں" تحریروں" خطبوں اور نصیحتوں سے نہیں ہو سکتا لیکن اب بھی بات صاف نہیں ہوئی کہ امام دراصل کہنا کیا چاہتے ہیں۔ وانّما خرجتُ لطلبِ الاصلاح فی اُمّۃ جدّی صلی اللہ علیہ و آلہٖ ارید ان امر بالمعروف وانھی عن المنکر۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ اس قیام کے دوران میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروں۔ واسیر بسیرۃ جدّی وابی علیّ بن ابی طالبٍ

اور اپنے نانا خاتم الانبیاءؐ اور اپنے والدِ بزرگوار علیؑ ابن ابی طالب کے طریقے پر چلوں۔ فمن قبل بقبول الحق فالله اولی بالحق لہٰذا جو شخص بھی حق کو قبول کرے تو اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ حق ہی کو پسند کرتا ہے۔

ومن رد علی ھٰذا اصبر حتی یقضی الله بینی وبین القوم بالحق وھو خیر الحاکمین۔ وھذہ وصیتی یا اخی الیك، وما توفیقی الا بالله علیه توکلت والیهِ اُنیبُ۔ لیکن اگر کوئی حق کو قبول نہ کرے تو میں پھر بھی صبر کروں گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا۔ یعنی اگر ضرورت ہو تو میں اکیلا ہی یہ راہ طے کروں گا۔ یہاں تک کہ اللہ میرے اور ان لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کر دے گا۔ وہی سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے۔ یہ میری تمہیں وصیت ہے اور توفیق اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کے پاس واپس جانا ہے۔ مجھے اپنی گزارشات پیش کرتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا۔ وقت کا بھی خیال رکھنا ہے۔ بقیہ مضمون کسی اور مجلس میں پیش کروں گا۔ علی بن عیسیٰ اربلی کی کتاب کشف الغمہ میں محمد بن طلحہ سے روایت ہے اور اسی طرح سید ابن طاؤس کی کتاب لہوف میں منقول ہے کہ سید الشہداءؑ ماہِ شعبان کی تیسری تاریخ کو مکہ میں آئے اور شعبان، رمضان، شوال، ذی قعدا اور ذی الحجہ کی آٹھ تاریخ تک وہاں قیام کیا۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ فرزندِ پیغمبرؐ یکایک آٹھویں ذی الحجہ کو مکہ سے روانہ ہو جائیں گے اور حج کے اعمال انجام دیے بغیر عمرہ کر کے احرام کھول دیں گے۔ جب آپ نے عراق جانے کا عزم کر لیا قامَ خطیباً آپ نے ایک خطبہ دیا۔ یہاں آپ کی توجہ کا طالب ہوں۔ شاید بہت سے لوگوں کے لیے سید الشہداءؑ کے ان فقروں سے جو آپ نے اس موقع پر فرمائے مقصد کا کچھ سراغ نکل

سکے۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثنا اور خاتم الانبیاء پر درود کے بعد فرمایا: خطّ الموت علیٰ ولد آدم مخط القلادۃ علیٰ جید الفتاۃ۔ موت نے بنی آدم کو اس طرح نشان زدہ کر دیا ہے جیسے کسی جوان عورت کی گردن پر گلوبند کا نشان پڑ جاتا ہے۔ بات وہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے سید الشہداء نے مکہ میں بات کو اور کھول کر بیان کر دیا اور لوگوں کو بتلا دیا، اس وقت کیا صورت ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ بات موت اور شہادت کی ہے جس سے قطعاً یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ امتِ اسلامی کا بگاڑ اس حد سے تجاوز کر چکا ہے کہ جہاں روپیہ خرچ کرنے سے تحریری خدمت سے سوچ بچار یا اسی طرح کی کسی اور تدبیر سے یا مذہبی مجالس منعقد کرنے سے یا مذہبی تقریروں سے اس کی اصلاح ہو سکے۔ خود حسینؑ ابن علیؑ بھی اسی طرح کی کسی تدبیر سے اس شدید بگاڑ کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ خطّ الموت علیٰ وُلدِ آدم" اب تو اصلاح کا واحد راستا صرف شہادت ہی ہے۔ وہ بھی حسینؑ بن علیؑ جیسے کسی شخص کی۔ اس خطبے میں ساری گفتگو شہادت ہی سے متعلق ہے۔ مرنے کی بات ہے۔ رسولِؐ خدا کے پاس جانے کی بات ہے۔ کربلا کے بھیڑیوں کے ہاتھ میں پڑنے کی بات ہے۔ اس سفر کی بات ہے جس کا انجام شہادت ہوگا۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ امام حسینؑ نے غالباً یہ خطبہ ذی الحجہ کی ساتویں تاریخ کو مسجد الحرام میں مجمع عام کے سامنے دیا تھا۔ اس وقت حالات بظاہر حسینؑ ابن علیؑ کے لیے سازگار تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ جلد ہی یزید بن معاویہ خلافت سے علیحدہ ہو جائے گا۔ اس کا زوال ہو جائے گا اور خلافت حسینؑ ابن علیؑ کو مل جائے گی۔ سید الشہداء کے خصوصی نمائندے مسلم بن عقیلؑ کوفہ سے اطلاع دے چکے تھے کہ سب لوگ آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے سوا امامت و خلافت کا مستحق کسی کو نہیں سمجھتے اور نہ آپ کے علاوہ کسی کی سربراہی انہیں منظور ہے،

اس لیے جتنی جلدی ہو سکے آپ آجائیے۔ اس طرح صورتِ حال بظاہر ساز گار اور حالات موافق اور اطمینان بخش تھے۔ اس کے باوجود حسینؑ ابن علیؑ موت، شہادت اور عراق کے بھیڑیوں کی بات کر رہے تھے مطلب یہی ہے کہ آپ اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ بجز شہادت کے کوئی چیز نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

آج میں اپنی گزارشات اسی خطبہ پر ختم کرتا ہوں۔ وخطّ الموتُ علیٰ وُلدِ ادم مخطّ القلادۃ علی جیدِ الفتاۃ میں اس وقت نہ اس جملے کی دلآویزی اور دلکشی کی بات کرنا چاہتا ہوں اور نہ لفظ "خط" میں جو حسنِ تعبیر ہے اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مطلب اس فقرے کا یہ ہے کہ موت انسان کے گلے کا ہار ہے۔ وما اولھنی الیٰ اسلافی۔ میں اپنے اسلاف سے ملاقات کا کس قدر مشتاق ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک میں وہ راستہ نہ اختیار کروں جس پر چل کر میں اپنے بابا علیؑ اور نانا خاتم الانبیاءؐ کے پاس پہنچ جاؤں، میرے اندازے میں موجودہ اجتماعی بگاڑ کا علاج ممکن نہیں۔ اشتیاق یعقوب الیٰ یوسف جس طرح پیغمبر یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسفؑ کے عاشق و شیفتہ تھے، میں شہادت کا عاشق و فریفتہ ہوں۔ وخیّر لی مصرعٌ انا الاقیہ۔ اللہ کی طرف سے میری قتل گاہ کا انتخاب ہو چکا ہے اور اب میں وہیں جا رہا ہوں۔

اس جملے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا منصوبہ خدائے لم یزل کا ترتیب دیا ہوا تھا۔ حسینؑ ابن علیؑ کا ساختہ پرداختہ نہیں تھا۔ خدا نے ازل ہی میں اس خطرناک اجتماعی بگاڑ کی اصلاح کے لیے حسینؑ کو شہادت اور جانبازی کے لیے چن لیا تھا۔ "وخیّر لی مصرعٌ انا الاقیہ" کا اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ خدا نے امام حسینؑ کے لیے شہادت مقدر کر رکھی تھی یا امام حسینؑ نے تقاضائے وقت کے

مطابق خود شہادت کو گلے لگا لیا مطلب دونوں لحاظ سے درست ہے۔ اسکے بعد آپ نے مطلب کو اور واضح الفاظ میں بیان کیا۔ فرمایا: وکانّی باوصالی تتقطعھا عسلانُ الفلوات بین النواویس وکربلاء ۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ عراق کے بیابانی بھیڑیے نواویس اور کربلا کے درمیان میرے جسم کے ٹکڑے نوچ رہے ہیں۔ فیملأنّ منّی اکراشاً جوفاً اور اپنے بھوکے پیٹ بھر رہے ہیں واجربۃً سغباً ۔ اور اپنی خالی زنبیلیں پُر کر رہے ہیں۔ ان کا کام پیٹ بھرنا ہے اور میرا کام اس شدید اجتماعی بگاڑ کا مقابلہ کرنا۔ پھر وہی بات ہے وہی نقشہ ہے جو خداوندِ متعال نے مسلمانوں کے اس خطرناک اجتماعی بگاڑ کا امام حسینؑ کی شہادت کی شکل میں تجویز کیا ہے۔ لامحیص عن یومٍ خُطّ بالقلم جو قسمت کا لکھا ہے اس سے کوئی مُفر نہیں۔ ہم اہل بیتؑ کی خوشی وہی ہے جو اللہ کی رضا ہے۔ ہمارے بارے میں جو اسے پسند ہے ہم کو بھی وہی پسند ہے۔ رضی اللہ رضانا اھل البیت نصبر علیٰ بلائہٖ ویوفّینا اجر الصابرین۔ اللہ کی طرف سے جو مصیبت پیش آئے ہم اس پر صبر کرتے ہیں اور اللہ ہمیں اس کا اچھا اجر دیتا ہے۔ میں چند جملے چھوڑ دیتا ہوں۔ آخر کا یہ جملہ بھی غیر معمولی توجہ کا مستحق ہے۔ فرمایا: من کان باذلاً فینا مھجتہٗ وموطنا علیٰ لقاءِ اللہ نفسہٗ فلیرحل معنا فاننی راحلٌ مُصبحاً ان شاء اللہ۔ جو ہمارے لیے جان قربان کرتے اور خدا سے ملنے کے لیے تیار ہو، وہ ہمارے ساتھ چلے۔ میں انشاء اللہ کل صبح روانہ ہو رہا ہوں۔

اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ دینِ خدا، انسانی حقوق اور اسلامی معاشرے کے دفاع سے متعلق مسائل ہر دور میں مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی راہِ خدا میں

مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی وعظ و نصیحت کی اور کبھی اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں مضامین لکھنے کی تاکہ مسلمان ان مضامین کو پڑھیں اور ضروریاتِ دین سے باخبر ہوں۔ اس جملے میں سید الشہداء نے واضح کر دیا کہ آج وہ موقع نہیں کہ مالی امداد، قلمی جہاد یا زبانی وعظ و نصیحت سے دین اسلام کی مدد کی جا سکے۔ ومن کان باذلاً فینا مھجتہ۔ اور کبھی اجتماعی بگاڑ اس درجے تک پہنچ جاتا ہے کہ سوائے شہادت، جاں نثاری اور فداکاری کے اور کسی طرح فساد کو روکا نہیں جا سکتا اور بگاڑ کی بنیاد کو ڈھایا نہیں جا سکتا۔ من کان باذلاً فینا مھجتہ، کہہ کر آپ نے یہ واضح کر دیا کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اب جبکہ امام حسینؑ راہِ خدا میں قیام کر رہے ہیں، میں بھی پچاس روپیہ چندہ دے دونگا یا عبید اللہ بن حُر جعفی یہ کہیں کہ میں ایک مضبوط جنگی رہوار نذر کر دوں گا یا کوئی یہ کہے کہ میں پانچ تلواریں، سات زرہیں اور چار نیزے پیش کر دوں گا۔ امام حسینؑ کو نہ تلوار چاہیے، نہ زرہ اور نہ نیزہ۔ ملتِ اسلامیہ کی کجی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ان باتوں سے حالات درست نہیں ہو سکتے۔ مجھے فقط جان چاہیے۔ جو جان دینے کو حاضر ہو، وہ کل میرے ساتھ چلے۔ من کان باذلاً فینا مھجتہ، جو اپنا خون اس راہ میں دینے کے لیے تیار ہو وموطّناً علیٰ لقاءِ اللہِ نفسہ، خدائے متعال سے ملنے کے لیے آمادہ ہو فلیرحل معنا وہ ہمارے ساتھ چلے۔ میں کل صبح روانہ ہو رہا ہوں۔

آج محرم کی آٹھویں شب ہے۔ شاید گفتگو آپ کی توقع سے زیادہ طول کھینچ گئی۔ پانچ منٹ اور اجازت دیجیے۔ کچھ مصائبِ اہل بیتؑ کا ذکر ہو جائے۔ فلمّا راھم الحسین علیہ السلام مصرّاً علیٰ قتلہ یہ

نقرہ مقتل ہشام بن محمد بن سائب کلبی سے منقول ہے[1]۔ یہ بزرگوار امام صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ جب امام حسینؑ نے روزِ عاشورا دیکھا کہ اہلِ کوفہ ان کے قتل کا تہیہ کیے ہوئے ہیں آخذ المصحف ونشرہٗ وجعلہٗ علیٰ راسہٖ۔ تو آپ نے قرآن شریف کھول کر اپنے سر پر رکھا اور بہ آوازِ بلند کہا: یا قوم! بینی و بینکم کتاب اللہ وجدّی محمّد رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ۔ یا قوم بم تستحلون دمی؟ لوگو! میرے اور تمہارے درمیان فیصلے کے لیے اللہ کی یہ کتاب موجود ہے۔ میرے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ ہیں۔ لوگو! آخر تم کس جرم میں میرا قتل جائز سمجھتے ہو؟" قرآن میں آیۂ تطہیر، آیۂ مباہلہ اور سورۂ ہل اتی دیکھو۔ سنتِ خاتم الانبیاءؐ پر نظر ڈالو۔ اس کے بعد اگر تم سمجھو کہ میرا قتل روا ہے تو قتل کرو۔ اگر سمجھو کہ ناروا ہے تو اس فعلِ شنیع سے درگزر کرو۔

حیرت ہے کہ سید الشہداء اہلِ کوفہ کے دینی جذبے کو اپیل کر رہے تھے۔ مگر جب آپ نے دیکھا کہ یہ لوگ دینی جذبے سے بے بہرہ ہیں تو آپ نے ان کے انسانی جذبے کا سہارا لینا چاہا۔ اگر اہلِ کوفہ دین و مذہب سے لاتعلق ہیں، اگر انہیں خوفِ آخرت نہیں ہے تو آخر انسان تو ہیں۔ انسان کے بھی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ فاذا بطفلٍ لہٗ یبکی عطشاً۔ دیکھا تو ان کا ایک بچہ پیاس کی شدت سے بلک رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں یہ بچہ کون تھا۔ لڑکی تھی یا لڑکا۔ شیر خوار تھا جسے کوئی کنیز یا غلام خیمہ سے باہر لایا تھا یا خورد سال تھا کہ خود اپنے پاؤں سے چل کر خیمہ سے نکل آیا تھا۔ یہ سب معلوم نہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ یہ خود ابو عبداللہ امام حسینؑ کا ہی بچہ تھا۔ جب امام حسینؑ نے دیکھا کہ اہل کوفہ کے دینی جذبات کو برانگیختہ

---

[1] تذکرۃ الخواص، سبط ابن جوزی

نہیں کیا جا سکتا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا ایک بچہ خیمہ سے باہر نکل آیا یا کوئی اس کو باہر لے آیا ہے۔ وہ پیاس کی شدت سے رو رہا ہے، تڑپ رہا ہے تو سید الشہداؑ نے میرے الفاظ میں "انسانی جذبات کا سہارا لیا۔ فَاَخَذَ عَلٰی یَدِہٖ وَقَالَ : یَا قَوْمِ! اِنْ لَّمْ تَرْحَمُوْنِیْ فَارْحَمُوْا ھٰذَا الطِّفْلَ۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ اے عراقیو! اگر تم کو مجھ پر ترس نہیں آتا تو اس معصوم بچے پر ہی رحم کرو لیکن انہوں نے عجیب جذبے کا اظہار کیا۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ جس طرح دینی جذبے سے خالی ہیں، اسی طرح انسانی جذبے سے بھی بے بہرہ ہیں۔ اس کا ثبوت وہ تیر تھا جو کمان سے نکل کر بچے کے حلقوم میں پیوست ہو گیا اور بچہ شہید ہو گیا۔

کتنا نازک تھا فریضہ جو بجا لائے حسینؑ
تا بہ دل حلقۂ مذہب کو بڑھا لائے حسینؑ
کلمہ رسم کے پھندے سے چھڑا لائے حسینؑ
حق کو ناحق کی ملاوٹ سے بچا لائے حسینؑ
نقل کو اصلِ حقیقت میں کھپنے نہ دیا
ڈھونگ اسلامِ مجازی کا پنپنے نہ دیا
جوشؔ

نصب تو نے کر دیے انساں کی عظمت کے خیام

مرحمت تو نے کیا توقیرِ آدم کو دوام

جھوم کر تو نے شہادت کا پیا جس وقت جام

روحِ دوراں نے محمدؐ کو کیا جھک کر سلام

مصطفیٰؐ کی کشتیٔ نازش کو کھینے کے لیے

انبیاءؑ آئے مبارکباد دینے کے لیے

جوشؔ

(ڈاکٹر حسینی بہشتی)

کامیاب جدّوجہد

اَعُوذُ بِاللّٰہِ السَّمِیعِ الْعَلِیمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ
عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ
وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ۔ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ
لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ
عَدْنٍ۔ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا۔ نَصْرٌ مِّنَ
اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (سورۂ صف آیات ۱۰-۱۳)

"اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے۔ وہ یہ ہے کہ تم اللہ اور اسکے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ ایسا کروگے تو اللہ تمہارے گناہ معاف کردیگا اور تم کو جنت کے ایسے باغوں میں داخل

کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور ایسے عمدہ مکانوں میں داخل کرے گا جو ہمیشہ رہنے والے باغوں میں ہوں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ثمرہ بھی ہے جو تمہیں پسند ہے اور وہ یہ کہ اللہ کی طرف سے مدد اور جلد فتح یابی اور اے پیغمبر مومنوں کو بشارت دیدیجیے۔"

جب سے انسان پیدا ہوا ہے اس کی تقدیر میں مسلسل جدوجہد لکھ دی گئی ہے۔ خود اس کی سرشت میں متضاد عوامل کارفرما ہیں۔ وہ طرح طرح کی خواہشات اور بوقلموں تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکب ہے۔ اس کے بعض رجحانات ہوا و ہوس کے قبیل سے ہیں جن کو حیوانی خواہشات کہا جا سکتا ہے جن کا مقصد کھانے پینے اور دیکھنے جیسی حیوانی لذتوں سے بہرہ مند ہونا ہے۔ اس میں کچھ اور ایسے رجحانات بھی ہیں جو اسے ان لذتوں سے ہٹا کر بلند تر روحانی، ذہنی اور انسانی لذتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ انسان کی توانائیاں اور اس کا ارادہ ان متضاد اور مختلف النوع خواہشات کی آماجگاہ ہے۔ انسان ہمیشہ اپنی متضاد خواہشات کی وجہ سے الجھن کا شکار رہتا ہے۔ دیکھیے آدمی جب کوئی معمولی سا کام بھی کرنا چاہتا ہے تو اگر اسے اس کام کی عادت ہے تو وہ اپنی عادت کی بنا پر بلا تامل اس کام کو انجام دے لیتا ہے لیکن اگر کام نیا ہے اور اسے اس کام کی عادت نہیں تو وہ ایک دم اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور خیالات آتے ہیں۔ وہ کبھی سوچتا ہے یہ کام کروں اور کبھی سوچتا ہے کہ نہ کروں۔ کبھی کہتا ہے کہ یہ کام ٹھیک ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہوس کہتی ہے کرلو، عقل کہتی ہے مت کرو یا عقل کہتی ہے کرلو، ہوس کہتی ہے مت کرو۔ ایک مدت تک اس کے دل اور دماغ میں اس طرح کی کشمکش رہتی ہے۔ بالآخر کوئی ایک رجحان غالب آجاتا

ہے اور اس کے مطابق وہ اپنی توانائی اور ارادے کو کام میں لاتا ہے۔ ہوس اور عقل، مادیت اور روحانیت میں ازل سے جنگ جاری ہے اور زندگی کی بنیاد اسی کشمکش پر رکھی گئی ہے۔ اس اندرونی کشمکش کے علاوہ بیرونی دنیا میں بھی انسان کو اپنی خواہشات اور مقاصد کے حصول کی راہ میں ان گنت مشکلات اور رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ ہمیں ایسی مشکلات کی عادت ہو گئی ہے اور یہ ہمارے لیے کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے اس لیے روزمرہ زندگی میں ہمیں ان کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ورنہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو دن میں کئی بار آدمی کو کچھ رکاوٹیں پیش آتی ہیں، ان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور ان کے خلاف جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ انسانی زندگی ہر ماحول میں ایک مسلسل کشمکش اور نزاع سے عبارت ہے۔ فرد کی زندگی کو چھوڑیے۔ برادری اور معاشرے کی زندگی میں، اقوام و ملل کی زندگی میں ہر جگہ یہی جنگ اور مقابلے کا قانون جاری ہے۔ ایک پیشہ کے افراد کا دوسرے پیشہ کے افراد سے، ایک برادری کا دوسری برادری سے، ایک قوم کا دوسری قوم سے، ایک معاشرے کا دوسرے معاشرے سے، ایک طبقے کا دوسرے طبقے سے ہمیشہ مقابلہ جاری رہتا ہے جس کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً قومی، بین الاقوامی اور بین الطبقاتی جنگیں برپا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انسانی زندگی میں کشمکش اور مقابلہ ایک ناگزیر حقیقت ہے۔

کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ جب سے وہ اس دنیا میں آنکھ کھولیں تب سے پچاس سال، ستر سال، سو سال تک بہتر سے بہتر زندگی گزاریں کھائیں پیئیں، سوئیں اور ہر طرح کے عیش و آرام اور فارغ البالی میں زندگی بسر کریں۔ صبح کو تو دس بجے تک گھر میں آرام کریں۔ پھر اگر دل چاہا تو کچھ کام کر لیا

اور نہ چاہا تو نہ کیا۔ اگر کہیں باہر کام پر گئے بھی تو دوپہر کو واپس آگئے۔ قیلولہ کیا اور رات کو پھر وقت پر سو گئے۔ گو ہمیں نظر نہ آئے لیکن ایسا شخص بھی ایک اندرونی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اسے وہ نشاط اور لبشاشت نصیب نہیں ہوتی جو زندگی میں جدوجہد کرنے والے کو حاصل ہے۔ وہ چلتا پھرتا کھاتا پیتا ضرور ہے لیکن اس کی مثال اس مردہ کی سی ہے جو امنگ اور جوش سے محروم ہے۔ اسکے باوجود بھی وہ ایک اندرونی کشمکش اور پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ ممکن ہے اس کشمکش کی اسے عادت ہو جانے کی وجہ سے اس کو احساس نہ ہو لیکن اس کے دل میں ہمیشہ رہ رہ کر یہ خیال تو ضرور آتا ہے کہ وہ بیکار کیوں بیٹھا ہے۔ وہ دوسروں سے پیچھے کیوں رہ گیا ہے؟ اس کو عزت و شہرت کیوں حاصل نہیں؟ یہ بے نتیجہ زندگی کس کام کی ہے؟ اس میں جوش، لگن اور امنگ کیوں نہیں ہے؟ وہ اپنی تن آسانی اور بیکاری کے لمحات غالباً اس حیص بیص میں گزارتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کشمکش اور جدوجہد کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ زندگی فرد کی ہو یا کسی معاشرہ کی مقابلہ، جدوجہد اور کشمکش کا قانون ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ چونکہ قانون یہی ہے۔ انسان کی سرنوشت یہی ہے کہ جدوجہد ناگزیر ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہم ایسی جدوجہد کا انتخاب کریں جو سود مند اور مفید ہو، اور ایسا مقابلہ ہونا چاہیے جو شریفانہ، ثمر بخش اور بامقصد ہو۔ آج کی گفتگو کا موضوع یہی کامیاب جدوجہد ہے اور اس کا انتخاب ان تاریخی واقعات کی مناسبت سے کیا گیا ہے جو ان تاریخوں میں پیش آئے۔

کامیاب جدوجہد کی کچھ شرائط ہیں جن کا جاننا اور زندگی کی جدّوجہد میں ان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جدوجہد کا کوئی متعین اور واضح مقصد ہونا

چاہیے۔ بے مقصد جدوجہد کے کوئی معنی نہیں۔ ہر جدوجہد کا مقصد تو ضرور ہوتا ہے، مگر عموماً مبہم ہوتا ہے۔ واضح اور صاف نہیں ہوتا۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک شخص عمر بھر ہاتھ پاؤں مارتا ہے مگر آخر میں اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کی کوشش اور جدوجہد کی کوئی ایک راہ معین نہیں تھی۔ اس نے کام کیا، کوشش کی، لیکن اس کا مقصد واضح اور طے شدہ نہیں تھا۔ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا۔ اس کی محنت اکارت گئی اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اگر اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس طرح کی بیکار اور بے مقصد کوششوں کی بکثرت مثالیں ملیں گی۔ آپ لوگوں میں سے شاید ہر ایک نے اپنی یا اپنی قوم کی زندگی میں ایسی بے مقصد جدوجہد کی مثالیں اور نمونے دیکھے ہوں گے یا کتابوں میں پڑھے ہوں گے۔ جدوجہد کا واضح اور غیر مبہم ہدف اور مقصد ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی یہ مقصد بلند پایہ اور بامعنی ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ مقصد واضح اور معین ہے مگر اس کے حصول کے لیے آدمی وقت تو صرف کر سکتا ہے لیکن اگر مال خرچ کرنے کی بات آئے تو آمادہ نہیں ہوتا۔ کبھی وہ مقصد کو اس سے زیادہ اہم سمجھتا ہے اور مال خرچ کر کے مقصد حاصل ہو جائے تو وہ اس میں مضائقہ نہیں سمجھتا لیکن اگر صحت و تندرستی کو داؤ پر لگانا پڑے تو پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی صحت کی قربانی دینے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے لیکن جب جان خطرے میں نظر آتی ہے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے ہیں، کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور آدمی پیچھے ہٹ جاتا ہے لیکن کبھی مقصد اتنا بلند ہوتا ہے کہ آدمی اس کے لیے نہ صرف یہ کہ اپنی جان بلکہ اپنے عزیز ترین اقربا کو بھی پورے خلوص کے ساتھ قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ بیش قیمت مقصد ہے جس کی طرف ہر انسان کو توجہ کرنی چاہیے۔ یہ مقصد رضائے الٰہی

کا حصول ہے۔ یہ ہوئی کامیاب جدوجہد کی پہلی شرط۔

دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی مستعد ہو، اسے کام کی لگن ہو اور وہ اپنی بات پر قائم رہے۔ خود قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ۔ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ۔

"یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے اور اپنے اس اقرار پر قائم رہتے ہیں (موت کے وقت اور قیامت کے دن) ان پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ ڈرو نہیں اور رنج نہ کرو۔ فرشتے ان کو جنت کی بشارت دے کر کہیں گے کہ یہ ہے وہ جنت جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم تمہارے دوست تھے دنیا میں بھی اور دوست ہیں آخرت میں بھی۔ اس جنت میں تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے جس کو تمہارا دل چاہے اور جو کچھ تم مانگو۔" (سورۃ حٰم سجدہ۔ آیات ۳۰-۳۱)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ (سورۃ صف۔ آیات ۲-۴)

"اے ایمان لانے والو! (یعنی اے وہ لوگو کہ حبیب رسولِ خدا

تیرہ سال تک مکہ میں توحید کی دعوت دیتے رہے، جب تو سوائے ایک چھوٹی سی تعداد کے تم نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ ہاں جب مدینہ آکر انہوں نے اسلامی حکومت تشکیل دی تو تم بھی اسلام کے فریفتہ اور شیفتہ بن گئے اور لگے اسلام کا دم بھرنے!) تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے؟ اللہ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تم ایسی بات کہو جس پر تمہارا عمل نہیں۔ اللہ تو ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح ایک جان ہو کر لڑتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔"

مفسرین کہتے ہیں کہ جنگِ بدر کے بعد جب کچھ مسلمانوں نے دیکھا کہ شہدائے بدر کی اللہ، رسول ؐ اور مسلمانوں میں بڑی عزت اور بڑا مرتبہ ہے اور ان کو دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں مل گئی ہیں۔ دنیا میں بھی ان کی عزت ہے اور آخرت میں بھی ثواب ہے تو یہ مسلمان آپس میں بیٹھ کر کہنے لگے: یَا لَیْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ فَنَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا کاش ہم بھی جنگ بدر میں شرکت کر کے جہاد میں حصہ لیتے اور ہمیں بھی وہ عزت ملتی جو بدریوں کو حاصل ہوئی۔ یہ ایسی ہی بات تھی جیسا کہ آجکل کے شیعہ اکثر بلکہ بعض تو شاید ہر روز میدانِ کربلا کے شہیدوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: یَا لَیْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ فَنَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا۔ اے کاش ہم آپ کے ساتھ ہوتے اور یہ عظیم سعادت ہمارے حصہ میں بھی آتی۔ یہ لوگ جہاں کہیں بیٹھتے تھے یہی ذکر اذکار رہتا تھا۔

اتفاق کی بات کہ کچھ عرصے کے بعد جنگ احد کا واقعہ پیش آیا۔ انہی لوگوں میں سے کچھ نے جن کی زبان پر ہر وقت یہ تھا کہ کاش جنگِ بدر میں ہمیں شہادت کی سعادت حاصل ہوتی شروع سے ہی پسپائی اختیار کی اور آخر یہ

نوبت آگئی کہ خود رسولِ خدا کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ یہی لوگ جو شہادت کی آرزو کرتے تھے، جب پیغمبرِ اسلام اور مسلمانوں کو خطرہ لاحق ہوا تو اپنی جان بچانے کی فکر کرنے اور کوئی جائے پناہ ڈھونڈنے لگے۔

اس موقع پر خدا کہتا ہے وہ بات کیا ہوئی جس کی تم تمنا کرتے تھے۔ تم تو کہتے تھے کاش جنگِ بدر دوبارہ ہو اور ہم شہادت کی سعادت حاصل کریں۔ ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے۔ اللہ ان لوگوں سے سخت ناراض ہوتا ہے جو فقط باتیں بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ہر طرح کی فداکاری اور جاں نثاری کے لیے تیار ہیں لیکن جب عمل کا موقع آتا ہے تو چھپتے اور جائے پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ خدا ایسے لوگوں سے ناراض ہوتا ہے کیونکہ یہ رہنماؤں کو دھوکا دیتے اور کامیاب جدوجہد کو بے اثر بنا دیتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے اور دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ جدوجہد کو کامیاب بناتے ہیں۔

ایک تیسری شرط جو بہت اہمیت رکھتی ہے اور ہم لوگوں میں کم دیکھنے میں آتی ہے وہ ہے جدوجہد کے صحیح طریقے کا انتخاب۔ جدوجہد کی ایک دو قسمیں نہیں ہیں مثلاً انفرادی جدوجہد، اجتماعی جدوجہد، خفیہ جدوجہد، علانیہ جدوجہد، نرم جدوجہد، سخت جدوجہد، مسلح جدوجہد، غیر مسلح جدوجہد، سرد ہتھیاروں سے جدوجہد، گرم ہتھیاروں سے جدوجہد، میدان جنگ سے دور مقامی جدوجہد، میدانِ جنگ میں جدوجہد وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا موقع، اپنا وقت اور اپنا طریقہ ہے۔ یورپ کی اصطلاح میں ہر جدوجہد کے اپنے اپنے ٹکٹکس ہیں۔ جو لوگ کسی مقصد کے لیے جدوجہد کا بیڑا اٹھاتے ہیں انہیں اس کا طریقہ بھی معلوم ہونا چاہیے۔ مقصد اور جدوجہد کے طریقے اور نوعیت میں مناسبت بے حد

اہم ہے۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ بڑے خلوص، دلچسپی اور نیک نیتی سے کسی مقصد کے لیے روپیہ خرچ کرتے ہیں، وقت صرف کرتے ہیں اور بعض اوقات جان کی قربانی بھی دیتے ہیں لیکن غلط طریقے سے۔ وہ اپنے خیال میں یہ سب کچھ نیک مقصد کے لیے کرتے ہیں لیکن ان کا طریقہ درست نہیں ہوتا۔ ان کے مقصد اور طریقے میں کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
ایں رہ کہ تو میروی بترکستان است

میں پھر کہتا ہوں کہ مقصد اور اس کے حصول کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جائے ان دونوں میں مناسبت کا ہونا بے حد ضروری اور بہت اہم ہے۔ اکثر جدوجہد اس لیے ناکام رہیں کہ ان کے لیے صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ اب اگر آپ حضرات یہ تین شرائط ذہن میں رکھیں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ کربلا کے حادثۂ فاجعہ نے کیا رخ اختیار کیا تھا۔ معاویہ کے بعد یزید جس کا فسق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی، بادشاہِ اسلام اور جانشینِ رسولؐ کی حیثیت سے مسلمانوں پر حکومت کرتا تھا، مگر وہ علانیہ شراب پیتا تھا، جوا کھیلتا تھا۔ غیر طبقاتی اسلامی معاشرے میں اس نے طبقاتی اور خاندانی امتیاز پیدا کر دیا تھا۔ یہ تھا نتیجہ اس کی حکومت کا۔

ایسے شرابی، بے عقل اور بے سمجھ شخص کے خلیفہ ہونے پر چند جانبازوں نے اس کی بدعنوان حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کم از کم وہ اس کے ساتھ تعاون پر آمادہ نہیں تھے۔ مگر یزید کہاں چھوڑتا تھا۔ اس نے اپنے تمام عمال، سرداروں اور گورنروں کو حکم دیا کہ سب لوگوں خصوصاً سربرآوردہ لوگوں سے اس کے لیے بیعت یعنی تعاون کا عہد لیا جائے لیکن مدینہ جو اسلام کا گہوارہ

تھا وہاں کے چند ممتاز اور مشہور لوگ یزید کی حکومت کو باضابطہ طور پر تسلیم کرنے اور اس کے کارندوں کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان ہی میں سے ایک امام حسینؑ تھے۔

اسی دوران میں کوفہ میں کچھ لوگ جمع ہوئے۔ مناسب ہوگا کہ میں کوفہ کا قدرے تعارف کرادوں۔ کوفہ خراب شہر بھی تھا اور اچھا شہر بھی تھا۔ خراب تو اس لیے تھا کہ وہاں بڑی تعداد میں ایسے لوگ رہتے تھے جو ڈرپوک تھے، فیصلہ کرنے میں ہچکچاتے تھے اور اس لیے ناقابل اعتماد تھے۔ اچھا اس لیے تھا کہ وہاں وہ درخشاں ستارے بھی تھے جنھوں نے امیرالمومنین امام علیؑ کی سرپرستی میں تربیت پائی تھی۔ گو ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن انھوں نے اپنے دل میں غور کیا کہ کیا یزید کی بیعت مناسب ہے؟ پھر عوام سے مشورہ کیا۔ سب نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ یزید ہرگز اس منصب کے لائق نہیں۔ اب سوال پیدا ہوا کہ پھر کس کی طرف رجوع کیا جائے؟ ادھر ادھر ٹوہ لینے پر سنا کہ حجاز میں دو تین بلکہ اس سے بھی زیادہ ممتاز لوگوں نے یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے۔ ان میں سب سے قدآور شخصیت ابوعبداللہ امام حسینؑ کی تھی۔ چنانچہ ان سے خط و کتابت شروع کی۔ ان کو دعوت دی اور لکھا گیا کہ آپ اپنے والد کے پایۂ تخت میں تشریف لائیے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم آپ کی ہمرکابی میں اس حکومت سے جنگ کریں۔ مقابلے کے لیے زمین ہموار ہے۔ امام حسینؑ کے پاس ایک خط پہنچا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا، یہاں تک کہ خطوط لانے والے ایلچیوں کا تانتا بندھ گیا۔ دس خط، بیس خط، سو خط۔ کسی پر ایک شخص کے دستخط تھے، کسی پر دو کے، کسی پر پانچ دس کے۔ حضرت کے پاس مختلف جگہوں سے خطوط کا ڈھیر لگ گیا۔ غرض جیسا کہ آپ کو تفصیل سے معلوم ہے، مسلم بن عقیل حضرت کی طرف سے کوفہ

آئے تاکہ صحیح صورتِ حال معلوم کر کے امام کے لیے لوگوں سے بیعت اور عہد و پیمان لیں اور امام کو اس کی اطلاع دیں تاکہ امام یہ طے کر سکیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ یہ تھی امام کے قیام اور مقابلے کی ابتداء۔

لیکن ابو عبداللہ کا مقصد کیا تھا؟ کیا ان کا مقصد حکومت پر قبضہ کرنا تھا؟ کیا ابو عبداللہ یہ چاہتے تھے کہ بلادِ اسلامی، خصوصاً عراق اور کوفہ پر حکومت کریں؟ نہیں، ان کا مقصد حکومت حاصل کرنا نہیں تھا۔ ان کی غرض اعلائے کلمۂ حق تھی۔ حق اور باطل میں تمیز تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ خواہ حکومت ملے یا نہ ملے لوگوں پر یہ بخوبی روشن ہو جائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اگر حکومت مل سکے تو فبہا۔ ایسی صورت میں حکومت کی طاقت سے وہ کام لیں جو خدا کو پسند ہے لیکن اگر حکومت ہاتھ نہ آ سکے جب بھی ان کا مقصد کہیں نہیں گیا۔ میدانِ کربلا میں جو واقعات پیش آئے تاریخ نے ان کو ہمیشہ کے لیے سنہری حروف میں لکھ لیا ہے۔ کربلا میں مسلمانوں کا جہاد ابد تک کے لیے حق و باطل کے درمیان جنگ کا عالی ترین نمونہ قرار پا گیا ہے۔ سبحان اللہ! کتنا بلند اور ارفع مقصد تھا اور ساتھ ہی واضح، روشن اور فیصلہ کن۔ آپ نے جنگ کے لیے کن لوگوں کا انتخاب کیا۔ ان مردانِ ثابت قدم کا جو اجتماعی جدوجہد میں پیش قدمی کے خواہاں تھے جو ابو عبداللہ سے سبق لینا چاہتے تھے۔ اس جدوجہد میں دو طرح کے لوگ شریک تھے۔ ایک تو وہ جو جنگ میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار انجام دے رہے تھے۔ ضرورت تھی کہ یہ لوگ کار آزمودہ اور قابلِ اعتماد ہوں۔ ان کے بازو قوی اور ہمتیں بلند ہوں۔ وہ ثابت قدم ہوں۔ اپنا فرض پہچانتے ہوں۔ فرماں بردار اور وفا شعار ہوں۔ ان کا نمونہ مسلم بن عقیل ہیں۔ ایک دوسرا نمونہ قیس بن مسہر صیداوی ہیں جنہوں نے امام کا خط کوفہ میں پہنچایا تھا۔

ابو عبداللہ نے ان لوگوں کا انتخاب کمال احتیاط سے کیا تھا۔ ایک اور گروہ تحریک کے حامیوں کا تھا۔ ضرورت کے وقت ان سے مدد لی جا سکتی تھی لیکن ان کے انتخاب میں اس قدر کدوکاوش کی گنجائش نہیں تھی۔ ان کا کام صرف متابعت تھا۔ ان میں سے بھی کچھ حسینی قافلے کے ساتھ ہو گئے تھے۔ جب مسلم مدینہ سے چل کر کوفہ پہنچے تو وہاں کچھ نئے واقعات پیش آئے۔ ایک جم غفیر مسلم کے گرد جمع ہو گیا۔ کوفہ کا والی نعمان بن بشیر معزول کر دیا گیا۔ اس کے بجائے ابن زیاد کو مقرر کیا گیا۔ ابن زیاد خونخوار اور بہت سخت گیر تھا۔ اب چوبیس گھنٹے کے اندر حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ آٹھویں ذی الحجہ کو عصر کے وقت مسلم کو خبر ملی کہ کمزور طبیعت لوگوں کی بدولت ان کے میزبان ہانی بن عروہ کو دھوکے سے دارالامارہ پہنچا دیا گیا ہے۔ ابن زیاد نے وہاں ہانی کی سخت توہین کی۔ لکڑی سے ان کے سر اور چہرے پر ضربیں لگانے کے بعد ان کو قید کر دیا۔ ہانی کے قید ہو جانے پر مسلم نے خاص آدمیوں سے کہا کہ وہ تحریک کے حامیوں کو مطلع کر دیں کہ وہ کوفہ کی مسجد اور اس کے اطراف میں جمع ہو جائیں تاکہ وہ ان سے وہاں خطاب کر سکیں۔ دارالامارہ مسجد کے سامنے ہی ہے۔ ابن زیاد کئی دن سے کوفہ کا حاکم اور مصروف کار تھا لیکن اس کے پاس تیس سے زیادہ پولیس والے نہیں تھے۔ ان کے علاوہ بنی امیہ کے حامی بیس آدمی اور تھے جو اس کے ساتھ تھے۔ ابن زیاد اور اس کے ان تقریباً پچاس ساتھیوں نے بالاخانے پر چڑھ کر نظر دوڑائی کہ دیکھیں مسجد میں کیا ہو رہا ہے۔ جیسے ہی ان لوگوں نے ابن زیاد اور اس کے حامیوں کو دیکھا ان کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیے اور ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں پر پتھراؤ کرنے لگے۔ ابن زیاد اور یزید کی حکومت کو گالیاں دینے لگے۔ یہ تھی صورت کوفہ میں ابن زیاد اور حضرت مسلم کی۔

آٹھویں ذی الحجہ کی شام کو ابن زیاد نے اس صورتِ حال کا بغور مطالعہ کیا۔ آخر اس نے کچھ ایسی چالیں چلیں جن کی تفصیل عرض کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اس نے کچھ لوگوں کو بھیجا جو ایک ایک، دو دو اور چار چار کر کے لوگوں کو مسجد سے باہر لے گئے۔ ماں آئی اپنے بچے کو لے گئی۔ باپ آیا اپنے بیٹے کو لے گیا یا بہن آئی داماد کو لے گئی۔ چچا آیا بھتیجے کو لے گیا۔ کوئی کسی کو لالچ دے کر لے گیا اور کوئی دھمکی دے کر۔ مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو مسلم نے چاہا کہ مغرب کی نماز پڑھیں۔ فقط تیس آدمی باقی تھے جنہوں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز ختم ہوئی تو مسلم نے مسجد سے باہر جانا چاہا۔ دیکھا تو وہاں کوئی آدمی نہ آدم زاد۔ انہیں اپنی منزل کا بھی صحیح راستا معلوم نہیں تھا۔ کوفہ کے گلی کوچوں سے ناآشنا تھے۔ اجنبی بے یار و مددگار۔ کوئی نہیں رہا تھا جو راستا ہی بتلاتا۔ یہ تھے کوفہ کے ناقابل اعتبار اور بے وقعت لوگ۔ یہ لوگ ہرگز اس قابل نہیں تھے کہ ان کے بھروسے پر کوئی جدوجہد کی جا سکتی۔ یہ نمونہ ہے ان ناقابل اعتبار لوگوں کا جن کے متعلق مسلم نے امام کو لکھا تھا اور مسلم کے کہنے پر امام مکہ سے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں بہت سے لوگ حسینی قافلے میں شامل ہوتے رہے۔ لوگ آتے رہے۔ یہاں تک کہ عراق کے نزدیک پہنچ کر امام کو اطلاع ملی کہ حالات وہ نہیں رہے جن کی مسلم نے اطلاع دی تھی۔ حالت بالکل بدل چکی ہے۔ مسلم اور ہانی قتل ہو چکے تھے۔ عبداللہ بن یقطر جو مسلم اور اہل کوفہ کے نام امام کا خط لے کر گئے تھے وہ راستے ہی میں گرفتار ہو کر قتل ہو چکے تھے۔ شیخ مفید، ارشاد میں لکھتے ہیں کہ مسلم آٹھویں ذی الحجہ کو منگل کے دن کوفہ پہنچے تھے اور نویں ذی الحجہ کو بدھ کے دن شہید ہوئے (ارشاد مطبوعہ اصفہان صفحہ ۱۹۸)۔ بہرحال ان وحشت ناک خبروں کی وجہ سے حسینی تحریک رک نہیں گئی۔

البتہ اس کا طریقۂ کار اور حکمتِ عملی ضرور بدل گئی۔ اب چونکہ حالات بدل چکے تھے حضرت نے اپنے سب ہمراہیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا اور اس کے بعد وہاں آکر ایک تحریر پڑھی۔ خدائے عز و جل کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: کوفہ سے جو اندوہناک خبریں آرہی ہیں وہ تم نے سن لی ہوں گی۔ مسلم، ہانی اور عبداللہ بن یقطر قتل ہو چکے ہیں۔ لوگوں نے ہمارے ساتھ دغا کی ہے۔ میں اپنا سفر جاری رکھنا چاہتا ہوں تاکہ میں بھی قتل ہو جاؤں۔ تم میں سے جو شخص مال و منال، مقام و منصب اور خوشحال زندگی کی امید میں میرے ساتھ آیا ہے وہ چلا جائے۔ چنانچہ جو لوگ راستے میں سے قافلے کے ساتھ ہو گئے تھے ان میں سے بیشتر چلے گئے۔ صرف امام حسینؑ بن علیؑ رہ گئے اور وہ لوگ جو مدینہ سے ان کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے علاوہ صرف چند افراد جو راستے سے ساتھ ہوتے تھے، ثابت قدم رہے۔ قدرتی طور پر دوسروں کے حوصلے جواب دے گئے۔ چونکہ اب جد و جہد کا نقشہ بدل چکا تھا، اس لیے صرف پاک طینت اور راسخ العقیدہ افراد ہی ساتھ دے سکے۔

کربلا میں ضرورت بھی ایسے ہی لوگوں کی تھی جو باہمت اور بلند حوصلہ ہوں مقصد پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں اور جان کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔

جنگ اور مقابلے کی صورت میں ایک چیز کی بڑی اہمیت ہے۔ جو افراد رابطے کے لیے استعمال کیے جائیں وہ صحیح اور قابلِ اعتماد ہوں اور رابطے کا پورا نظام تجربہ کار ایماندار اور مقصد سے وفادار افراد پر مشتمل ہو۔ رابطے کے لیے ایک ایسی قابلِ قدر شخصیت کی مثال قیس بن مسہر صیداوی تھے جو امام حسینؑ کا اہلِ کوفہ کے نام خط لے کر کوفہ کی طرف آرہے تھے۔ قادسیہ کے نزدیک ابن زیاد کے ایک افسر حصین بن نمیر نے ان کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ ابن زیاد نے ان سے کہا کہ اگر جان کی امان چاہتے ہو تو منبر پہ جا کر امام حسینؑ کو گالیاں دو۔

قیس نے منبر پہ کھڑے ہو کر کہا۔ سب تعریف اللہ ہی کو زیبا ہے۔ حسینؑ بن علیؑ خلائق میں بہترین ہیں۔ آپ دختر رسول خدا فاطمہؑ کے فرزند ارجمند ہیں۔ انہوں نے مجھے پیغام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ یہ پیغام میں آپ سب لوگوں تک پہنچا دوں۔ آپ سب لوگ فوراً ان کی امداد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس کے بعد قیس نے امام علیؑ اور امام حسینؑ پر درود بھیجا اور معاویہ، یزید اور عبیداللہ بن زیاد پر نفرین کی۔ انہوں نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ عبیداللہ ابن زیاد نے کہا کہ اس کو منبر پر سے اتار دو۔ چنانچہ انہیں منبر سے اتار کر محل کی چھت سے نیچے پھینک دیا گیا اور وہ شہید ہو گئے۔ غرض امام حسینؑ اپنی مختصر سی جماعت کے ساتھ کوفہ کی طرف گامزن رہے۔ راستے میں حر سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے اپنا راستا بدل دیا اور ایک ایسے راستے پر چل پڑے جو نہ کوفہ جاتا تھا اور نہ مدینہ تاکہ سوچ سکیں کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔ واقعات پر غور کیجیے۔ پہلے تو امام مدینہ سے مکہ گئے اور پھر کربلا کا رخ کیا۔ مقصد صاف اور واضح ہے۔ دین حق، حقیقت اور قانون الٰہی کا دفاع اور رضائے الٰہی کا حصول۔ طریقہ اور روش بھی متعین ہے۔ امام حسینؑ جانتے تھے کہ اس راستے پر چلنا چاہیے کہ جہاں سے پھر واپسی کا سوال ہی نہ ہو۔ اگر امام نے راستے میں اور حتیٰ کہ عاشورا کے دن بھی ابن زیاد کے عہدہ داروں سے یہ کہا کہ اگر اہل کوفہ نہیں چاہتے کہ میں ان کے شہر میں جاؤں تو مجھے چھوڑ دو۔ میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں گا تو اس معاملے کے کچھ اور پہلو تھے۔ ورنہ اثنائے راہ میں امام نے مکرر یہ فرمایا تھا کہ جس راستے پر ہم چل رہے ہیں اس میں واپسی نہیں ہے۔ امام قصر بنی مقاتل کی منزل سے روانہ ہو رہے تھے۔ ابھی حُر نے ابن زیاد کو جو خط لکھا تھا اس کا جواب نہیں آیا تھا اس لیے یہ بات صاف نہیں ہوئی تھی کہ آخری فیصلہ کیا ہوگا۔ عقبہ بن سمعان کہتے ہیں کہ میں امام کے

قریب ہی تھا۔ میں نے دیکھا کہ امام اپنی سواری ہی پر اونگھنے لگے۔ ذرا ہی آنکھ لگی تھی کہ پھر بیدار ہو گئے۔ فرمایا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ آپ نے تین بار یہی فرمایا۔ آپ کے فرزند دلبند علی اکبرؑ نے آگے بڑھ کر عرض کیا: بابا جان کیا بات ہے آپ اِنَّا لِلّٰہ پڑھ رہے ہیں؟

فرمایا: بیٹے! سواری پر سو گیا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے قافلے کے لوگ جا رہے ہیں اور موت ان کا پیچھا کر رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ علی اکبر نے کیا کہا ہو گا۔

انہوں نے عرض کیا: کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟

امام نے فرمایا: کیوں نہیں۔

انہوں نے کہا کہ پھر موت کا کیا ڈر؟ ہم آخری سانس تک راہ حق سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ ہم موت کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اسی طرح کے افراد کی امام حسینؑ کو ضرورت تھی۔ نینوا اور کربلا پہنچنے سے پہلے امام نے ایک مرتبہ پھر کہا تھا کہ ہم موت کے استقبال کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ ضروری بھی تھا کہ لوگوں کے ذہن نشین کر دیا جائے کہ وہ کوفہ کی حکومت حاصل کرنے نہیں آئے تاکہ کل کلاں کو لوگ یہ نہ کہیں کہ آئے تو تھے اہل کوفہ کے بلانے پر۔ بعد میں جب دیکھا کہ کوفہ پر قبضہ کرنا ممکن نہیں تو غیرت کو جوش آیا اور فیصلہ کر لیا کہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔ حکومت سے محرومی کی تلخی کو برداشت نہ کر سکے۔ اسی لیے آپ نے بار بار کہا کہ اگر تمہیں میرا آنا پسند نہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ یہ خیال نہ کرو کہ میری غیرت جوش میں آگئی ہے۔ حکومت سے محرومی کے بعد اب مجھ میں زندہ رہنے کی تاب نہیں۔ اب میں خودکشی پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ آپ نے یہ جملہ بار بار اس لیے دہرایا تاکہ کوئی ان کے متعلق وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ

والی آیت نہ پڑھ دے۔ واقعۂ کربلا کی صحیح تفسیر اور توجیہ کے لیے اس جملہ کا تاریخ میں رہنا اور بار بار دہرایا جانا ضروری ہے اس سے وہ تمام چھوٹے چھوٹے واقعات جو روز عاشورا تک اس تمام مدت کے دوران پیش آئے بخوبی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ آپ حضرات اس نکتے کو خوب غور سے سمجھ لیجیے کہ امام کیا چاہتے تھے۔ واقعۂ کربلا میں دشمن کی تحریف اور رنگ آمیزی کے باوجود اس واقعہ کی جو تفصیل اگلی نسلوں تک پہنچی ہے اس میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ عاشورا کے دن جب معلوم ہو گیا کہ جنگ ناگزیر ہے تو امام حسینؑ نے صف بندی کرنے کے بعد حکم دیا کہ سب خیمے ایک جگہ لا کر جمع کر دیے جائیں۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ خیموں کی پشت پر جو خندق کھودی گئی تھی اس میں کافی مقدار میں لکڑیاں ڈال کر ان میں آگ لگا دی جائے تاکہ دشمن پیچھے کی طرف سے حملہ نہ کر سکے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی بہتر نفری فوج کو ترتیب دیا اور اس زمانے کے جنگی طریقے کے مطابق میمنہ، میسرہ اور قلب لشکر قائم کیے۔ پرچم دار اور علمدار مقرر کیے۔ ابھی حضرت اپنے لشکر کو ترتیب دے ہی رہے تھے کہ دشمن کے کچھ پیادہ اور سوار سپاہیوں نے باہم مشورہ کیا کہ چلو حسینی خیمہ گاہ پر پیچھے سے حملہ کر دیں۔ ان میں سے ایک بلکہ ان سب کا گرو گھنٹال شمر تھا۔ یہ لوگ منصوبے کے مطابق حملہ کرنے کے لیے آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں تو خندق کھدی ہوئی ہے اور اس میں آگ روشن ہے۔ گویا زبردست جنگ کی تیاری ہے۔ یہ لوگ امام حسینؑ کی اس کارروائی سے بڑے دل شکستہ ہوئے۔ شمر نے چلا کر کہا کہ حسینؑ روز قیامت کا بھی انتظار نہ کیا۔ دنیا ہی میں اپنے ہاتھ سے اپنے لیے آگ تیار کر لی۔ شمر کا یہ جملہ حسینؑ کے طرفداروں اور خیر خواہوں کے دلوں میں زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح لگا اور ان کے جگر چھلنی کر گیا۔ مسلم بن عوسجہ نے عرض کیا کہ مولا مجھے اجازت

دیجیے کہ میں اس خبیث کو یہیں سے ایک تیر مار کر جہنم رسید کر دوں۔

غور کیجیے امام نے کیا فرمایا، آپ نے فرمایا: نہیں، میں اس کے لیے تیار نہیں کہ جنگ ہماری طرف سے شروع ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا دیکھے کہ میں اس پیغمبر کی پیروی کر رہا ہوں جس نے تمام جنگیں اسلام کے دفاع میں لڑیں۔ کسی کو یہ جرأت نہیں ہونی چاہیے کہ یہ کہے کہ پیغمبر اور خاندان پیغمبر نے اپنی بات بزور شمشیر اونچی رکھنے کی کوشش کی۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا دیکھ لے کہ میں نے لڑائی شروع نہیں کی۔ آپ نے مسلم بن عوسجہ سے فرمایا کہ تم تیر مت چلاؤ۔ لڑائی ان کو شروع کرنے دو۔ اس کے بعد آپ نے دوبارہ صف بندی کی، پھر فرمایا پہلے مجھے ان لوگوں سے بات کرنے دو۔ پھر اپنے رہوار پر سوار ہو کر بڑی شان سے دشمن کے لشکر کی طرف بڑھے اور دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر بہ آواز بلند سب کو خاموش رہنے اور اپنی بات سننے کے لیے کہا۔ جب سب لوگ چپ ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہو گئے تو آپ نے تقریر شروع کی۔ امام کی تقریر میں دو تین جملے بڑے توجہ طلب تھے۔ ایک تو آپ نے یہ فرمایا کہ لوگو! اگر تم مجھے نہیں پہچانتے تو جاؤ اورا   توں سے پوچھو جو تم میں سے خاندانِ پیغمبر سے واقف ہیں۔ وہ تم سے میرا تعارف کرا دیں گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں رسولؐ خدا کا فرزند ہوں۔ اب سوچیے کہ امام حسینؑ میدان کربلا میں عاشورا کے دن کیوں اپنا تعارف کرا رہے ہیں؟ اس لیے کہ کل کو کوئی دغاباز منافق مکر و فریب سے یہ نہ کہہ سکے کہ ابن زیاد نے ہمیں بے وقوف بنایا، دھوکا دیا۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ یہ کوئی اور شخص ہے جو آیا ہے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ فرزند رسولؐ ہے تو ہم ہرگز اس سے جنگ نہ کرتے بلکہ اس کی مدد کرتے۔

حضرات! میں نے جو یہ نکتہ بیان کیا ہے اس پر ذرا بھی تعجب نہ کیجیے۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ لوگ کس طرح حقائق کو توڑ مروڑ کر دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس زمانے میں تو رسل و رسائل کے ذرائع بہت ہی کم تھے۔ لوگوں کو حقائق کا علم بہت کم تھا۔ ابلاغ کے تمام وسائل حکومت کے ہاتھ میں تھے اس لیے ان دنوں حقائق کو مسخ کرنا بہت آسان کام تھا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟ دیکھو شام میں معاویہ نے امام علیؑ کو کس کس طرح بدنام کیا۔ ایسے میں اس پر تعجب کیوں ہو کہ امام حسینؑ کو یہ فکر لاحق تھی کہ مبادا کل کو یہی لوگ کہنے لگیں کہ اگر ہم جانتے کہ یہ مسافر جسے دعوت دے کر بلایا گیا ہے حسینؑ بن علیؑ ہیں تو ہم ان کے دفاع میں جان لڑا دیتے۔ یہ وجہ تھی کہ امام حسینؑ نے اپنا تعارف خود کرایا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ لوگو! تم یہاں مجھ سے مقابلہ کرنے آئے ہو؟ کیا تم نے ہی مجھے نہیں بلایا تھا؟ وہ تمہارا بلاوا کیا ہوا؟ اور اب میرے مقابلے کے لیے تمہارے آنے کا کیا مطلب ہے۔ کیا اس دوران میں مجھ سے کوئی ایسی خطا ہو گئی ہے، کوئی ایسا گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ میرا خون حلال ہو گیا اور مجھے مار ڈالنا روا ہو گیا؟ کیا میں نے تم میں سے کسی کو قتل کیا ہے؟ آخر تم کس بنیاد پر میرے قتل کے درپے اور میرے خون کے پیاسے ہو گئے۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا تاکہ آئندہ کوئی طوطا چشم کوفیوں کے فعل کی یہ توجیہہ نہ کرنے لگے کہ جو کوئی حکومتِ وقت کے خلاف اٹھے وہ باغی ہے اور اسکا خون مباح ہے۔

جہاں تک امام عالی مقام کے قصے کا تعلق ہے خود ان ہی لوگوں نے تو امام کو بلایا تھا۔ آپ یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ خود تم نے ہی مجھے دعوت دی تھی۔ میں نے تمہاری ہی دعوت قبول کی ہے۔ تم نے ہی کہا تھا کہ خدا کا دین پائمال ہو رہا ہے۔ میں دین اسلام کے دفاع کے لیے یہاں آیا ہوں۔ اب تم کس منہ سے کہو گے کہ ہم نے حسینؑ کو پہلے تو بلایا، ان کے ساتھی اور حامی

بنے اور پھر کربلا میں ان کو شہید کر دیا۔ کیا تاریخ میں سرخروئی کی یہی باتیں ہیں۔ یہ ہیں واقعۂ کربلا سے متعلق کچھ سبق آموز اور توجہ طلب نکات۔ مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا وہ تو میں کر چکا۔ اب آیئے کہ آج کی رات شہید کربلا کا ماتم کریں اور نوحہ خوانی کریں۔ کوئی صاحب یہ کام انجام دیں۔ اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا اس کا ماحصل یہ ہے کہ سب مسلمان، سب ہواخواہان و شیفتگانِ حسینؑ اور سب پیروان توحید یہ سمجھ لیں کہ زندگی میں کشمکش ناگزیر ہے۔ جدو جہد ہمیشہ جاری رہنی چاہیے۔ لذیذ ترین اور شیریں جدوجہد وہ ہے جو حق کی حمایت میں اور باطل کے خلاف ہو۔ حق کی سوچ کا زندہ رکھنا اور قانون حق کو نافذ کرنے کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جدوجہد ایک درخشندہ اسلامی روایت ہے اور اگر اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کرنا مقصود ہے تو پھر ہدف ایسا ہونا چاہیے جو شک و شبہ سے بالاتر ہونے کے ساتھ ساتھ صاف، روشن، واضح اور قابل اعتماد ہو۔ یہ ہدف جب لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ اس کو مان لیں اور دل و جان سے اس کے لیے کوشش کریں اور بوقت ضرورت جان و مال نثار کرنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ زمانہ کے حالات کے مطابق حکمت عملی وضع کی جائے اور زمان و مکان کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر لائن آف ایکشن اختیار کی جائے۔

اگر ان سب باتوں کا دھیان رکھا جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ اللہ کی مدد ضرور شامل حال ہو گی۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (سورۂ محمدؐ آیت) اے ایمان والو! اگر تم جدوجہد کرو گے تو خدا ضرور تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔"

اگر راہِ خدا میں جان و مال کی قربانی دو گے تو سمجھ لو اوّل تو دین و دنیا کی بھلائی اور کامیابی حاصل ہوگی دوسرے جنت الفردوس کے مستحق بنو گے اور تیسرے وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۔ ایک اور چیز بھی ملے گی جو تمہیں پسند ہے اور وہ ہے اللہ کی مدد اور جلد فتح، لہٰذا مومنوں کو یہ خوشخبری سنا دو۔"

زباں سے کرتے ہو دعویٰ حسینیت کا اگر
دکھاؤ کچھ تو حسینؑ شہید کے جوہر
سجو وہ اسلحہ جن پہ فدا ہو فتح و ظفر
ثباتِ عزم کی تلوار لو، حیا کی سپر
جو حیدری ہو تو ہمت کرو، دلیر بنو
بڑھو، نہ بڑھ کے ہٹو، بڑھتے جاؤ، شیر بنو
جوشؔ

تیرگی کی جیب میں تھی دولت شمس و قمر
جل رہا تھا خانۂ دیر بینۂ فکر و نظر
زندگی پر یوں جہنّم کا تسلّط دیکھ کر
ایک عظیم انسان بہرِ خدمتِ نوعِ بشر

رنگ بھرنے زندگی کے نقش میں قانون کا
دوش پر لیکر سبُو آیا خود اپنے خون کا

جوشؔ

(استاذ موسوی)

جہاد و شہادت

أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ۔
بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ۔ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا
اَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ۔ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا۔
(سورہ نساء آیت ۷۶)

" جو ایمان لائے ہیں وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو منکر ہیں وہ لڑتے ہیں طاغوت کی راہ میں۔ پس لڑو شیطان کے ساتھیوں سے۔ یقیناً شیطان کا پھیلایا ہوا جال کمزور ہے۔"

جن اہم اسلامی موضوعات پر اکثر بحث ہوتی رہی ہے ان میں سے ایک جہاد کا موضوع ہے۔ قرآن مجید کی بیشتر آیات پر اگر صحیح طریقے سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر چند آیات کے بعد ایک آیت میں جہاد کا حکم موجود ہے۔ ایک طرف یہ کہ جو آیات اعتقادی، اجتماعی اور اخلاقی اصولوں اور احکام کے بارے میں آئی ہیں ان میں کسی نہ کسی عنوان سے جنگ اور جہاد کا تذکرہ ہے تو

دوسری طرف گزشتہ چند صدیوں سے اسلام کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اس کا تعلق بھی مسلمانوں کی پیش قدمیوں، جنگوں اور فتوحات سے ہے۔ یہاں تک کہ اس غلط پروپیگنڈے نے کم و بیش ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں تک کو متاثر کیا ہے۔ مسلم اور غیر مسلم محققین میں جو اہلِ انصاف ہیں انہوں نے بھی دفاع اور جہاد کے اسلامی اصولوں پر کتابیں لکھی ہیں۔ اسلام میں جہاد کا کیا مطلب ہے اور اسلام نے کیسے ترقی کی؟ کیا جزیرۃ العرب میں کوئی عظیم انقلاب آیا تھا؟ اس فکری، اخلاقی اور اجتماعی انقلاب میں طرفین کا کس قدر جانی نقصان ہوا؟ صدرِ اسلام کی ابتدائی جنگیں دفاعی نوعیت کی تھیں یا ان کا مقصد جارحانہ پیش قدمی تھا؟ یہ سب اپنی جگہ اہم سوال ہیں لیکن اگر ہم ان تمام امور پر بحث شروع کر دیں تو اندیشہ ہے کہ ہم اپنے اصل مقصد سے ہٹ جائیں گے اور جو مطالب اس وقت بیان کرنا مقصود ہیں وہ رہ جائیں گے۔

مذہبی اور اجتماعی احکام اور قوانین و قواعد سے قطع نظر، دفاع ایک فطری اور نفسیاتی معاملہ ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسانی فطرت میں ایک اصول رکھا ہے۔ ایک قوت پیدا کی ہے جسے قوتِ غضبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ قوت جانوروں میں بھی مختلف شکلوں میں موجود ہے اور اس کا مقصد اپنی زندگی اور اپنے حق کا دفاع ہے۔ ہر جاندار کو زندہ رہنے کا حق ہے اور اس حق کے دفاع کے لیے فطری طور پر وہ اپنے اعضاء و جوارح سے کام لیتا ہے۔ پروردگار عالم نے یہ قوت نہ صرف ہر جاندار کی فطرت میں ودیعت کی ہے، نباتات میں بھی یہ قوت موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نباتات کی بعض اقسام تو اس لیے ہیں کہ دوسرے جاندار ان کے پھلوں اور پھولوں سے استفادہ کریں اور بعض کا وجود صرف بقائے نفس اور افزائش کے لیے ہے۔ گو دوسرے ان کی دلکشی اور خوبصورتی

سے محفوظ ضرور ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ پھلدار درختوں میں سخت اور خشک کانٹے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ پھولوں میں بھی تیز کانٹے ہوتے ہیں۔ پھولوں کے گرد خنجر نما کانٹے پھول کی اس باطنی قوت کی نشاندہی کرتے ہیں جو بزبانِ حال کہتی ہے کہ میری زیبائی، رعنائی، نزاکت، مہک اور خوشبو کا تقاضا ہے کہ کسی جفا کار کا ہاتھ مجھ تک نہ پہنچ سکے۔

کل کے جلسے میں ایک نوجوان نے کچھ شعر پڑھے تھے۔ مجھے ان میں سے دو شعر یاد رہ گئے۔ پہلا شعر میں بھول گیا ہوں۔ بہرحال کسی نے خوب کہا ہے[1]

خواری خللِ درونی آرد
بیداد گری زبونی آرد
می باش چوں خار حربہ بردوش
تا خرمنِ گل کشی در آغوش

"ذلت کی زندگی سے آدمی بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے اور ظلم و ستم کے نتیجے میں بے بس اور لاچار ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھولوں کا گچھا اگر گود میں لینے کی خواہش ہے تو کانٹے کی طرح مسلح اور دفاع کے لیے تیار رہو۔"

یہ اشعار واقعی از روئے بلاغت ایک طرح سے معجزہ ہیں۔ شاعرانہ پیرائے میں ایک حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ذلت و خواری سے

---

[1] یہ شعر نظامی گنجوی کے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:

تا چند چوں یخ فسردہ بودن
چوں موش در آب مردہ بودن

آدمی کا نفسیاتی توازن بگڑ جاتا ہے۔ جو لوگ ذلت اور زبونی کی زندگی بسر کرتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ حقائق کا بخوبی ادراک کر لیں لیکن وہ اپنے ہاتھ اور زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ یہی خلل کا مطلب ہے۔ واقعی اس کی اس سے بہتر تعبیر ممکن نہیں۔ خلل سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کی قوتوں میں ہم آہنگی باقی نہیں رہتی۔ ذلت، نفسیاتی خلل پیدا کرتی ہے۔ پھول اگر اپنی تازگی اور حسن قائم رکھنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ شاخِ گل پر قائم رہے تو ضروری ہے کہ کانٹے کسی جفا کار کا ہاتھ اس تک نہ پہنچنے دیں۔ پس یہی وہ فطری قانونِ مدافعت ہے جو جانوروں میں سینگوں، پنجوں اور دانتوں کی صورت میں اور انسانوں میں قوتِ غضبیہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ انسان کو عقل عطا کی گئی ہے جو اس کی تمام فطری قوتوں سے صحیح کام لینے کی ذمہ دار ہے اس لیے انسان اپنی قوت غضبیہ کو اپنے حق، اپنے ناموس، اپنی عزت اور اپنے قومی مفاد کی حفاظت کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسی بنا پر اگر ہم یہ فرض کریں کہ کوئی مقنن یا کوئی پیغمبر آکر یہ کہتا ہے کہ کسی قوم سے جنگ اور دفاع کی صلاحیت قطعاً ختم کر دی جانی چاہیے تو یہ بالکل ایسی ہی بات ہوگی جیسے کوئی مُصلح آکر یہ کہے کہ چونکہ شہوانی قوت بدعنوانیوں اور بسا اوقات تکلیف کا سبب بنتی ہے۔ اس لیے عورتوں اور مردوں کی اس صلاحیت کو یکسر ختم کر دیا جائے۔ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوتِ غضبیہ انسان میں باقی رہنی چاہیے البتہ یہ ضرور ہے کہ اسے صحیح راہ پر ڈالا جائے۔ جس طرح کہ پروردگارِ عالم نے انسان میں مختلف قوتیں اور صلاحیتیں پیدا کی ہیں۔ اسی طرح یہ ہدایت بھی کی ہے کہ ان کو صحیح طریقے سے آدمی کی بھلائی اور فائدے کے لیے استعمال کیا جائے۔ مثلاً شہوانی قوت کا مقصد بقائے نوعِ انسانی ہے۔ اسی طرح انسان میں غذا کی

خواہش اور اشتہاء پیدا کی گئی ہے تاکہ وہ اتنا کھائے جس سے اس کے جسم اور جان کا رشتہ قائم رہے۔ اگر شہوانی قوت کا صحیح استعمال نہیں کیا جائے گا تو یہی قوت بقائے نوع کے بجائے فنائے نوع کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ پُرخوری اور شہوت رانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی بجائے اس کے کہ اسّی یا سو سال جیئے، تیس اور چالیس سال کی عمر میں ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو ایک طرح کی خودکشی ہے۔ شہوانی قوت کا اگر ناجائز استعمال کیا جائے تو تولید و تناسل کے بجائے آدمی آتشک اور سوزاک میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے بچے پیدا کرنے کی قوت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

یہی حال قوت غضبیہ کا ہے۔ آدمی میں جب اس قوت کا ظہور ہو تو اسے چاہیے کہ اس ہتھیار سے مناسب کام لے کر اپنے حق، اپنے ناموس، اپنی عزت و شرافت اور اپنے ملک کا دفاع کرے لیکن پروردگار عالم نے اس قوت کا جو مصرف تجویز کیا ہے اگر اس کے خلاف عمل کیا جائے مثلاً بلاوجہ طرح طرح کے بہانوں سے جنگیں چھیڑ دی جائیں یا قومیت کے نام پر کشور کشائی اور دوسروں کے علاقوں پر غاصبانہ قبضے کی کوشش کی جائے تو یہی قوت نسل کشی کا ذریعہ بن جائے گی۔ چونکہ انسان میں قوت غضبیہ موجود ہے اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو قاعدے کا پابند کیا جائے اور یہ طے کیا جائے کہ اس کے اظہار کی کیا شکل ہونی چاہیے۔ اگر مذہب اور قانون کا وجود نہ ہوتا جب بھی دنیا کے عقلاء اور نیکوکار یہ خواہش کرتے کہ مل بیٹھ کر کوئی اصلاح کی صورت نکالی جائے۔ رہا یہ سوال کہ وہ کیا کرتے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے وہ کوئی ایسی ترکیب سوچ لیتے کہ دنیا سے جنگ کو بالکل ہی مٹا دیا جاتا۔ لیکن یہ صرف کہنے کی بات ہے۔ آج بھی ایسے دعوے کیے جاتے ہیں۔ تخفیف و تحدیدِ اسلحہ کی

کمیٹیاں اور مصالحتی مشن دن رات کام کرتے رہتے ہیں مگر صرف بالائے زمین، ایوانوں اور کمروں میں مگر ساتھ ہی زیرِ زمین کارخانے بڑی تیزی سے تباہ کن اور مہلک ترین اسلحہ بنانے میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ اوپر امن، اصلاح جنگ پر پابندی لگانے اور ایٹمی تجربے بند کرنے کی باتیں ہوتی رہتی ہیں اور ان ہی لوگوں کے قدموں کے عین نیچے ایٹم بم بنتے رہتے ہیں۔ پھر کیا کرنا چاہیے؟ یہ کرنا چاہیے کہ قوتِ غضبیہ راہِ حق میں صرف ہو۔

اسلام یہی کہتا ہے۔ اسلام نے جدال و قتال کو جہاد کا نام دیا ہے۔ ساتھ ہی فی سبیل اللہ کی قید بھی لگا دی ہے۔ قرآن، حدیث اور ہماری دینی تعلیمات میں جہاد فی سبیل اللہ کا حکم آیا ہے۔ فی سبیل اللہ کے معنی ہیں خدا کی راہ میں۔ اب خدا کی راہ کہاں ہے؟ کس طرف ہے؟ آسمان کی طرف ہے، کعبہ کی سمت ہے یا بیت المقدس کی جانب۔ دراصل راہِ خدا سے مراد ہے عام انسانی معاشرے کی بھلائی اور بہتری کا راستا۔ یعنی انصاف اور حق کا راستا۔ انسانی آزادی کا راستہ جس میں چند لوگ یا کسی ایک طبقہ کے افراد عوام کی صلاحیتوں پر اس طرح مسلّط نہ ہو جائیں کہ وہ معاشرے کی سوچ کا راستا مسدود کر دیں اور عوام کو ان قدرتی وسائل تک رسائی حاصل نہ کرنے دیں جو خداوندِ عالم نے سب کے لیے بنائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو باطنی قوتوں اور روحانی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس نے یہ ہوا، یہ فضا، یہ روشنی سب کے فائدے کے لیے پیدا کی ہے تاکہ سب لوگ اپنی صلاحیتوں اور جسمانی و روحانی قوتوں سے استفادہ کر سکیں۔ اسی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے جَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللهِ کا حکم آیا ہے۔ جہاد کرو اور وہ بھی راہِ خدا میں۔ ہمارے فقہی قانون کا ایک باب، باب الجہاد بھی ہے۔ اس کو ملاحظہ فرمائیے۔ جہاد پر عبادات کے ضمن میں

بحث کی جاتی ہے۔ ہماری فقہ کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ عبادات سے متعلق ہے، دوسرا معاملات سے۔ عبادات اور معاملات میں فرق یہ ہے کہ عبادات میں قربت کا قصد لازمی ہے: جیسے نماز، روزہ، حج، زکات، خمس، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور جہاد۔ یہ سب عبادات ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص تلوار ہاتھ میں لے کر کفار سے جا کر لڑے مگر قربت کی نیت نہ ہو تو اسے ثواب نہیں ملے گا۔ وہ اگر قتل اور شہید بھی ہو جائے جب بھی اجر سے محروم رہے گا۔ ثواب صرف اسی صورت میں ہوگا جب قربت کے قصد سے جہاد کرے۔ قربت کے معنی ہیں خدا سے نزدیکی۔ آیئے پھر دیکھیں کہ فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے۔ خدا کہاں ہے جو ہم اس سے نزدیک ہو جائیں؟ خدا حاضر و ناظر ہے۔ اس کے ارادہ اور صفات کا عالم میں ظہور ہے۔ افراد اور معاشرے کو اس کی صفات سے متصف کرنے سے اس کی قربت حاصل ہوتی ہے۔ خدا عادل ہے، حکیم ہے اس لیے عدل اور حکمت کو بروئے کار لانے اور رحمت اور خیر و برکت کے سرچشموں سے لوگوں کو مستفید کرنا ہی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اسی لیے جہاد کو عبادات کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔ جب ہم قرآنی آیات پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں قرآن میں جہاں بھی قَاتِلُوْا یا جَاهِدُوْا کا لفظ آیا ہے اس کے ساتھ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کی قید ضرور ہے۔ اس آیت میں جو میں نے بطور عنوان ابتدا میں تلاوت کی تھی، اللہ تعالٰی فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۔اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا۔ گویا اس قضیہ کا ایک حصہ تو ایک حقیقت مسلمہ ہے۔ دنیا میں جدال اور قتال کا نہ صرف وجود ہے بلکہ یہ انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اصل بات دوسرا

حصہ ہے۔ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا دوسرے اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔

زندگی جنگ اور جدوجہد سے عبارت ہے۔ اب جو لوگ باایمان ہیں اور جن کا ہدف ارفع و اعلیٰ ہے وہ راہِ خدا میں جنگ کرتے ہیں اور جن لوگوں میں یہ بات نہیں وہ راہِ طاغوت میں۔ آپ پوچھیں گے کہ طاغوت کے کیا معنی ہیں؟ یہ کس قسم کا لفظ ہے؟ جو لوگ قرآن پڑھتے ہیں کبھی انہوں نے اس لفظ پر غور کیا؟ طاغوت طغیان سے مبالغہ کا صیغہ ہے طَغَی الْمَآءُ کے معنی ہیں کہ پانی اتنا زیادہ ہو گیا اور اس کا دباؤ اس قدر بڑھ گیا کہ وہ اپنی اصل گزرگاہ سے باہر امنڈ پڑا، سیلاب آگیا جس نے اطراف کے مکانات کو تباہ کر دیا اور درختوں اور کھیتوں کو اجاڑ دیا۔ یہ معنی ہیں پانی کی طغیانی کے۔ طاغوت کے معنی ہیں وہ خودسر جو اپنی حد سے تجاوز کر جائے۔ مستبد اور ڈکٹیٹر کے الفاظ جو یونانی فلاسفر اور علمائے عمرانیات نے ایجاد کیے ہیں اور اب بھی استعمال ہوتے ہیں، ان سے یہ لفظ زیادہ جامع ہے کیونکہ مستبد جس کے معنی ہیں خودسر حاکم تو ممکن ہے کہ وہ خود اپنے ہی اوپر حکومت کرتا ہو اور اپنی ہی خواہشات کو دبا کر رکھتا ہو مگر طاغوت وہ خودسر اور سرکش ہے جو تمام معاشرتی حدود سے تجاوز کر جائے، سب کے حقوق کو پامال کرے، اس کی نفسانی اور شہوانی خواہشات اس قدر حد سے بڑھ جائیں کہ وہ تمام حدوں کو توڑ ڈالے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ طاغوت سے مراد بت ہے۔ یہ درست ہے کہ بت بھی طاغوت کا ایک مصداق ہے لیکن یہ معنی فی نفسہٖ لغت کے لحاظ سے کچھ زیادہ صحیح نہیں، نہ عام طور پر یہ لفظ ان معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں ہے: الطاغیۃ: الجبّار المتکبّر۔ الطاغوت: کلّ متعدّ، کلّ رأسِ ضلالۃٍ

شیطان الصارف عن الخیر۔ الاحمق :نصب ملوکِ الرّوم و
کل ملکٍ۔ طاغیہ : خود سر، ظالم، گھمنڈی۔ طاغوت : جو شخص حد سے گزر جائے
سخت گمراہ، شیطان جو نیک کاموں سے روکتا ہو، احمق، شاہانِ روم یا کسی اور
بادشاہ کا بت یا مجسمہ۔ سورۃ نساء کی ساٹھویں آیت میں ارشاد باری
ہے : یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ
یَّکْفُرُوْا بِہٖ " یہ لوگ اپنے مقدمے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں
حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کو نہ مانیں۔" اگر طاغوت سے مراد بت ہو تو
کوئی اپنا مقدمہ فیصلے کے لیے بت کے پاس نہیں لے جاتا۔ معلوم ہوا کہ اس
سے مراد بت نہیں۔ قرآن شریف میں شاید نو جگہ یا سات جگہ طاغوت کا لفظ آیا
ہے۔ یہ لفظ سورۃ بقرہ میں، دو بار تو آیت الکرسی ہی میں آیا ہے جیسا کہ معلوم
ہے آیت الکرسی کے پڑھنے کا بڑا ثواب ہے۔ خصوصاً نمازوں کے بعد۔

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔
فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ
اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی۔ لَا انْفِصَامَ لَھَا
وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا
اَوْلِیٰٓئُھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ۔

" دین میں زبردستی نہیں کیونکہ ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز
ہو چکی ہے، تو جو کوئی طاغوت کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان
لے آئے، اس نے ایک بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جو کسی طرح
نہیں ٹوٹ سکتا۔ اللہ بڑا سننے والا، جاننے والا ہے۔ اللہ حامی

ہے ان لوگوں کا جو ایمان لاتے۔ ان کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر نورِ اسلام کی طرف لاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے ساتھی طاغوت ہیں جو ان کو نورِ اسلام سے نکال کر کفر کی تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۶)

آدمی دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس کے اعمال، اس کا ارادہ اور اس کی سوچ خدا کے ہاتھ میں ہو گی۔ اس صورت میں بتدریج ہوا و ہوس کی تاریکیوں سے نکل کر علم و معرفت کی روشنی میں آجائے گا۔ اسے اپنا مستقبل روشن نظر آنے لگے گا۔ ورنہ طاغوت اس پر حاوی ہو جائے گا۔ انسان بغیر کسی سرپرست اور ولی کے نہیں رہ سکتا۔ یا اس کا ولی خدا ہو گا یا طاغوت۔ پیغمبر اور امام بھی ولی اور سرپرست ہیں۔ ان کو ہم اس لیے ولی کہتے ہیں کہ یہ ارادہٗ خداوندی کو نافذ کرنے والے ہیں، اس لیے وہ اللہ کے ولی ہیں۔ رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے: الست اَولیٰ بکم من انفسکم۔ کیا میں تم سے اس سے بھی زیادہ نزدیک نہیں ہوں جتنے تم خود اپنے آپ سے ہو؟ تم بت پرست بننا چاہتے تھے، تم جاہل رہنا چاہتے تھے، تم ایک دوسرے کا خون بہانا چاہتے تھے۔ تم کمزور، ذلیل، بے کس و بے بس رہنا اور ہمسایہ قوموں کی کاسہ لیسی کرنا چاہتے تھے۔ تم نے دیکھا کہ جب میں نے تمہارے معاملات اپنے ہاتھ میں لیے تو تمہیں سب کچھ مل گیا۔ روزِ غدیر رسولِ خداؐ نے اس طرح اتمامِ حجت کیا تھا، کیونکہ جو انقلاب آچکا تھا وہ سب کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ سب اس سے واقف تھے، اس لیے آپؐ نے فرمایا: الست اولیٰ بکم من انفسکم۔ اگر آدمی، اللہ اور اولیا کی تعلیم پر نہیں چلے گا تو پھر لامحالہ وہ طاغوت کے زیرِ تصرف آجائے گا۔ اس کی علامت اور اس کا نتیجہ بھی بیان

کردیا گیا ہے۔ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ۔ طاغوت آہستہ آہستہ اس کو نورِ فطرت اور عقل و ادراک کی روشنی سے محروم کر کے جہالت، بوالہوسی، عیاشی اور غلط سوچ کے اندھیروں میں دھکیل دے گا جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (مومن اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں) اس کے بالمقابل وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (کافر طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں) اس دنیا میں جنگ ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ اگر کبھی دنیا سے جنگ ختم ہو گئی تو پھر یا تو یہ دنیا ختم ہو جائے گی یا اس طرح بدل جائے گی کہ پھر وہ کوئی اور ہی دنیا ہو گی۔ یا یوں کہیے کہ اگر جنگ مٹ گئی تو انسانی فطرت ہی یکسر بدل جائے گی۔ اس صورت میں وہ کوئی اور ہی زندگی ہو گی۔ بہر حال اس دنیا میں جب تک انسان کی موجودہ فطرت باقی ہے جنگ کسی نہ کسی صورت میں جاری رہے گی۔ فرق یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو ایمان سے محروم ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں خواہ وہ ظالم اور سرکش ہی کیوں نہ ہوں۔ حدود سے تجاوز کرنے والے بعد میں پوچھتے ہیں کہ اس جنگ کا مقصد کیا ہے؟ یہ ایک اور نکتہ ہوا۔ اب تک میں نے کتنے ہی نکات بیان کیے ہیں، مجھے ان کی تعداد یاد نہیں۔ پہلا نکتہ تو یہ تھا کہ جنگ انسان کی اصل فطرت اور جبلّت میں شامل ہے اور یہ ممکن نہیں کہ جنگ کا دنیا سے خاتمہ ہو جائے۔ دوسرا نکتہ یہ تھا کہ مذہب جنگ کے خلاف نہیں۔ مذہب سے میری مراد دینِ کامل ہے، مسیحیت نہیں۔ مسیحیت بظاہر تو یہ تلقین کرتی ہے کہ جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بات مشہور ہے کہ حضرت مسیحؑ نے کہا: اگر تمہارے رخسار پر کوئی تھپّڑ مارے، تو دوسرا رخسار بھی اس کے سامنے کر دو، لیکن کیا عملاً کبھی ایسا ہوتا رہا ہے؟ یہ دنیا میں جو جنگیں

ہوتی رہتی ہیں، یہ کہاں سے آئیں ؟ کیا ہم مسلمانوں کی ایجاد ہیں ؟ یہ ساری خونریزیاں جو پچھلی ایک صدی میں ہوئیں خواہ داخلی جنگوں کی صورت میں ہوں خواہ عالمگیر جنگوں کی شکل میں، ان کا ذمہ دار کون تھا ؟ دوسری طرف مسیحیت تو یہ بھی کہتی ہے کہ اگر خداوند خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتے ہو، تو تجرد کی زندگی اختیار کرو۔ نہ عورت شادی کرے نہ مرد۔ کیا کبھی اس پر عمل ہو سکا ؟ کیا عیسائی یورپ شہوت رانی کا مرکز نہیں بن گیا ؟ یہ اس پابندی کا ردعمل ہے۔ عیسائیت کے نام پر صرف چند راہبوں اور راہبات نے خانقاہوں میں بیٹھ کر اپنے قوائے جسمانی کو معطل کر لیا۔ اگر واقعی مسیحیت کا یہی حکم ہے تو یہ کوئی عارضی اور وقتی حکم ہوگا۔ ورنہ یہ جھوٹ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حضرت مسیحؑ کی تصدیق کرتا ہے اس لیے یہی باور کرنا پڑے گا کہ اس طرح کی سب باتیں دروغ بے فروغ ہیں۔ رَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ۔ "یہ رہبانیت جو ان لوگوں نے ایجاد کر لی ہے اس کا ہم نے ان کو حکم نہیں دیا۔" (سورۂ حدید۔ آیت ۲۷)

رہبانیت صرف تجرد کی زندگی بسر کرنے کا ہی نام نہیں۔ گوشہ نشینی، حق و صداقت کا دفاع نہ کرنا اور اپنی ہستی کے دفاع کے حق اور قانون سے دستبرداری بھی درحقیقت رہبانیت ہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ رہبانیت دنیا کا عام قانون نہیں بن سکتا۔ دنیا کا بندوبست صرف اسی قانون کے ذریعے سے ممکن ہے جو اول تو انسانی جبلت کی تعمیر اور فطرتِ انسانی کے مطابق معاشرے کی تنظیم کرے اور ساتھ ہی یہ بھی کہے کہ فطری رجحانات انسانی جبلت میں تو داخل ہیں لیکن ان کو قتل و غارت گری، لوٹ کھسوٹ، شہوت رانی، ملک گیری اور استحصال کے لیے استعمال نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ ان کا استعمال صرف نیکی اور بھلائی کے لیے ہو۔ اپنے حق، اپنے ناموس اور اپنے ملک کا دفاع

کرو۔ آئین و قوانین کا دفاع کرو۔ عوام کے حقوق کا دفاع کرو۔ اس جبلت کو درجہ بدرجہ اسی سمت میں ترقی دو اور آگے بڑھاؤ۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِينَ ۔ تم ان کفار سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ کا ہو جائے۔ اگر یہ لوگ باز آجائیں تو پھر کسی پر سختی نہیں بجز ظالموں کے" (سورۃ بقرہ آیت ۱۹۲ اور سورۃ انفال آیت ۳۹)۔

یہ ہیں فی سبیل اللہ کے دو پہلو، ایک مثبت اور ایک منفی۔ لڑو مگر کس مقصد کے لیے؟ کشور کشائی اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے؟ نہیں، بلکہ حق کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤ اور انہیں ظالموں کی غلامی سے آزاد کراؤ۔ دوسرے انسانی زندگی کی دشواریوں کو دور کرو۔ وہ طاقتیں اور طبقے جو عوام کے حقوق کے مخالف ہیں، جو عوام کے حقوق اور ان کی آواز کو دباتے ہیں ان کو ختم کرو۔ یہ ہیں معنی فی سبیل اللہ کے! لوگوں کو گھٹن سے نجات دلاؤ تاکہ لوگ سرچشمۂ کائنات یعنی خدائے واحد سے آشنا ہو سکیں۔ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ" ان طاقتور طبقوں سے لڑ جاؤ جو اپنے مفاد کے لیے کمزوروں کو دھوکا دیتے ہیں اور ان کے لیے مصیبت بنے ہوتے ہیں، جو لوگوں کو راہِ حق سے ہٹا کر باطل کے پھندے میں پھنساتے ہیں اور توحید سے منحرف کر کے شرک، بت پرستی اور طاقت کی پوجا کے راستے پر ڈالتے ہیں۔ یہ ہیں انسانی زندگی کی وہ دشواریاں اور فتنے جنکو راستے سے ہٹانا ضروری ہے تاکہ انسانیت ترقی کر سکے اور وہ خاص طبقے نابود ہو جائیں جو عوام کے خون پسینے کی کمائی سے گلچھرے اڑاتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کے حقوق اس طرح پامال کرتے ہیں جیسے قیصر و کسریٰ کیا کرتے تھے۔ ایک مسلمان سپاہی نے کہا تھا بُعِثْنَا لِنُخْرِجَ الْاُمَمَ مِنْ ذُلِّ الْاَدْيَانِ اِلٰى عِزِّ الْاِسْلَامِ

جب یہ پا برہنہ عرب، ایرانی افواج کے کمانڈر کے سامنے پیش ہوا تو ایرانی کمانڈر نے پوچھا کہ کیا تم اس ملک پر قبضہ کرنے کے لیے آئے ہو؟ مال لوٹنے کے لیے آئے ہو؟ بھوکے ہو؟ ننگے ہو؟ ہم تم کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں گے۔ تمہارے افسروں کو بھی روپے دیں گے اور تمہارے سپاہیوں کو بھی۔ جاؤ اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔ اس نے اپنی دانست میں مسلمان سپاہی کو خاصا متاثر کر لیا تھا۔ مگر دیکھیے اس نے کیا جواب دیا اور اس کے الفاظ کس طرح تاریخ میں ثبت ہو گئے۔ اس مسلمان سپاہی نے ایرانی کمانڈر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک بڑی معنی خیز بات کہی۔ اس نے کہا کہ ہم اپنے پیغمبرﷺ کی طرف سے مامور ہیں کہ دنیا کی قوموں کو انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور ان مذاہب سے نجات دلائیں جو بعض خاص طبقوں کے مفاد کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور اس کے بجائے ہر ایک کو اس کا حق دلائیں اور عام لوگوں کو اسلام کے ذریعے سے عزت و افتخار کے درجات تک پہنچائیں۔ اِلٰی عِزِّ الْاِسْلَامِ۔ یہ ہے اسلامی جہاد اور یہ معنی ہیں جہاد کے یعنی حق کو پھیلانے اور اپنا حق لینے کے لیے کوشش کرنا۔ اسلام اس جد و جہد کو جنگ اور قتال نہیں کہتا بلکہ اس کو جہاد کا نام دیتا ہے یعنی حق کے لیے کوشش۔ فقہاء جہاد کا تذکرہ عبادات کے ضمن میں کرتے ہیں اور اس کے لیے فی سبیل اللہ کی شرط لگاتے ہیں۔

کسی نے رسولِ اکرمﷺ سے پوچھا کہ ایک شخص میدانِ جہاد میں اس لیے جاتا ہے کہ شاید کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آجائے۔ آپ نے تین بار فرمایا کہ اس کا خدا کے یہاں کوئی اجر نہیں۔ ایک اور شخص نے پوچھا کہ اگر کوئی شخص لڑائی پر اس لیے جائے کہ اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے یا اس لیے کہ لوگ اس کے کارنامے دیکھیں اور اس کو شہرت حاصل ہو۔ کیا ایسا شخص مجاہد فی سبیل اللہ ہے؟ آپ نے فرمایا مجاہد وہ ہے جو اس لیے جہاد کرے کہ کلمۃ اللہ ھی العلیا۔

یعنی اللہ کی بات بلند ہو اور اس کا منشا پورا ہو[1] یہی راہِ خدا ہے اور یہی معنی ہیں اسلامی جہاد کے۔ اس وقت اس سلسلے کی تمام آیات کا مطالعہ کرنے اور ان پر گفتگو کرنے کا موقع نہیں۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ صدرِ اول کے بعد مسلمانوں میں کجی پیدا ہوگئی تھی۔ اموی خلفاء کے زمانے میں جس طرح اسلام کی دوسری ہر چیز مسخ ہوگئی، اسلامی جہاد بھی مسخ ہوگیا کیونکہ اس کا تعلق بھی اسلام کے بنیادی اصولوں سے ہے۔ انگریز مورخ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے۔ اس کے الفاظ تو مجھے یاد نہیں بہرحال اس الزام سے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے، وہ اسلام کا دفاع کرتے ہوئے کہتا ہے: (اس بات کو ذرا اور بلند زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسلام حق ہے یا نہیں؟ اگر حق ہے، توحید اور خدا پرستی کا ضابطہ ہے، اس کا اپنا نظام ہے جس کی بنیاد منصفانہ قوانین پر ہے اور لوگوں کی بہتری اور فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کا حکم دیتا ہے تو پھر یہ دین حق ہے اور خدا کی طرف سے ہے)۔ اگر حق ہے تو پھر ضروری ہے کہ یہ پھیلے اور ترقی کرے۔ اگر تلوار سے نہ سہی تو دانتوں اور پنجوں سے سہی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام تلوار سے کیوں پھیلا؟ اصل سوال یہ ہے کہ حق پھیلا یا باطل؟ تمہاری دلیل یہ ہے کہ چونکہ تلوار سے پھیلا ہے اس لیے یہ مذہب باطل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں۔ چونکہ یہ مذہب حق ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے فروغ کے لیے تلوار استعمال کی جائے۔ الٹی طرف سے کیوں سوچتے ہو؟ اگر تمہیں اسلام سے عناد نہیں ہے، اگر اس پر اتہام لگانا اور یورپ کے مٹھی بھر متعصب عوام کی نظر میں اس کو داغدار کرنا نہیں چاہتے تو اس طرح بات کیوں کرتے ہو کہ اسلام کو پھیلانے کے لیے جنگیں لڑی گئیں، اس لیے اسلام باطل ہے۔ یوں کہو کہ چونکہ اسلام حق ہے اس لیے اس نے جنگ کا حکم دیا ہے۔ اگر کسی پودے پر پھول نہ آتے ہوں

---

[1] سورۂ توبہ۔ آیت ۴۰

تو اس کے گرد کانٹے کیوں اگائے جائیں۔ اگر آدمی کو زندہ رہنے اور اپنا دفاع کرنے کا انفرادی حق نہیں ہے تو پھر اسے قوتِ غضبیہ کیوں دی گئی ہے۔ جب آدمی کو یہ قوت دی گئی ہے تو اس کا ایک حق قائم ہو گیا اور جب اس کا حق ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس قوت کو استعمال کرے۔ البتہ کسی باطل مقصد کے لیے نہیں بلکہ اپنے حق کا دفاع کرنے کے لیے۔ یہی جہاد کی حقیقت ہے اس لیے یہ بات قطعاً ناقابل یقین ہے کہ ایک مذہب جو حق ہو اور خدا کی طرف سے آیا ہو اس کا دفاعی اور تبلیغی پہلو نہ ہو اور اسکی ترقی کے لیے انتظام نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا دین آتا جس کا اپنا دفاعی نظام نہ ہوتا تو ہم یہ نہیں مان سکتے کہ وہ یہ کہتا کہ وہ خدا کی طرف سے ہے' انسانیت کی بھلائی کے لیے ہے۔ تاقیامت لوگوں کی ہدایت اور بہبود اس کا مقصد ہے۔ اسلام وہ دین ہے جو انسانیت کی اصلاح چاہتا ہے۔ آدمی کا رخ حیوانی خواہشات سے موڑ کر اس کو براہِ راست خدا کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ دنیا میں عدل و انصاف کا بول بالا چاہتا ہے۔ مختلف قومی اور غیر قومی بہانوں سے جو صاحبانِ اقتدار لوگوں کو قتل و غارت گری اور آدم کشی کے لیے آلۂ کار بناتے ہیں ان کا خاتمہ چاہتا ہے تاکہ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ - دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔ ایک ایسا دین آئے اور وہ اپنی حقیقی روح کے ساتھ ہمارا دستورِ حیات بن جائے اس کے بعد ہمیں یہ کہنا زیب دیتا ہے کہ خدا ایک ہے اور اس نے ہماری ہدایت کے لیے ایک رسولؐ بھی بھیجا ہے اگر کوئی آکر تم سے پوچھے کہ اس بگڑی ہوئی دنیا کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے تو اُسے بتاؤ کہ اصلاح کی صورت یہ ہے کہ دنیا والے ـــ ان ظالموں کے خلاف جنگ کریں جو لوگوں کی جان' مال اور آبرو سے کھیلتے ہیں اور ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں ـــ ایک ایسی مقدس جنگ لڑیں جس کے ذریعے سے اس دور کے فرعونوں کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے' تو یہ کوئی بری بات نہیں۔ یہ ہے دین۔

جب کوئی کہے کہ "یہ حق ہے" تو ضروری ہے کہ وہ اسکے ہاتھ میں تلوار دیکر کہے کہ "یہ حق ہے" اور اس حق کو آگے بڑھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ لوگ پوچھیں گے کہ کہاں تک آگے بڑھنا چاہیے تو انہیں بتاؤ کہ جہاں تک دین بڑھتا جائے اور باطل حق کے آگے تسلیم ہو جائے۔ اب یہ لوگ مسلمان اور تمہارے بھائی ہیں۔

لیکن اگر وہ یہ کہیں کہ ہم اپنے عقائد پر باقی رہنا چاہتے ہیں، اپنے طریقے سے عبادت کریں گے لیکن عام اسلامی قانون کے تابع ہونا قبول کرتے ہیں تو ایسے لوگ ذمّی ہیں۔ جو ذمی ہو گیا اس کے حقوق بھی وہی ہیں جو مسلمان کے ہیں۔ اب کوئی عرب یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ اسلام کا ظہور میری سرزمین سے ہوا ہے اس لیے مجھے عجم پر فوقیت حاصل ہے بلکہ ایک عجمی جب مسلمان ہو گیا تو وہ بھی عربی کے برابر ہو گیا اور اگر وہ مقابلتاً زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے تو عربی سے بڑھ جائے گا۔ اسی طرح جو شخص اسلام کے اصول اور اس کی تعلیمات سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے اس کا درجہ بلند ہے۔ یہ ہے کسوٹی۔ کوئی چینی ہو، رومی ہو یا زنجباری ہو۔ کالا ہو یا گورا، جس نے حقیقت کو تسلیم کر لیا مسلمان ہو گیا۔ پھر سب مسلمان تمام حقوق میں مساوی ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی سے یہ کہے کہ چونکہ میں عرب ہوں اور تم سے پہلے مسلمان ہوا ہوں اس لیے میرا حق مقدم ہے اور چونکہ تم مجھ سے بعد میں اسلام لائے ہو اس لیے تمہارا حق مؤخر ہے۔ صدرِ اول میں اسلام میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، اس کی بنیاد یہی تھی۔ عرب آہستہ آہستہ اس غرور میں مبتلا ہو گئے کہ ہم سابق الاسلام ہیں اور اسلام کا سرچشمہ ہمارا ہی ملک ہے۔ اسی لیے ہمارا حق فائق ہے۔ اس بنا پر عربوں نے دوسروں کے حقوق غصب کرنے شروع کر دیے اور انہیں پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ یہی قومی اور نسلی تعصب بعد میں بھی مصیبتوں کا باعث بنتا رہا۔ آج بھی غیر ملکی حکام اور غیر ملکی ادارے جو مسلمانوں سے سوءِ ظن رکھتے ہیں، ان میں پھوٹ ڈالتے ہیں، ان کے

سامنے رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اس کا سبب بھی وہی قومی اور نسلی تعصب ہے۔ کاش کہ صدرِ اول کے پابند اسلام مسلمانوں کی طرح ہم سب بھائی بھائی ہوں، سب برابر ہوں، اگر جنگ کریں تو اس لیے کہ مستضعفین کو آزادی دلائیں۔

خلاصہ یہ کہ کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا مذہب ہو جو خدا کی طرف سے آیا ہو، لیکن اس کی ترقی اور دفاع کے لیے کوئی حکم نہ دیا گیا ہو؟ اگر ہم ایسا فرض کرنا بھی چاہیں تو درست نہیں ہوگا۔ آخر جنگ کس سے کی جائے؟ لڑائی کس کے خلاف ہو؟ کس کے خلاف جہاد کا حکم ہے؟ جہاد سے مراد یہ ہے کہ پہلے اسلام کی دعوت دی جائے۔ چونکہ یہ دعوت فطرت کے عین مطابق ہے اس لیے لوگ اسے ضرور قبول کریں گے۔ خاص طور سے وہ لوگ جو آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ایک گروہ جس میں حکمران ٹولہ اور مفاد پرست طبقہ شامل ہے اور جو چاہتا ہے کہ اس کا مفاد اسی میں ہے کہ لوگ حق پر جمع نہ ہو جائیں، قدرتی طور پر اس دعوت کی مزاحمت کرتا ہے اور یہیں سے جنگ چھڑ جاتی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طبقہ کو ختم کر دیا جائے۔ اس طرح وہ لوگ ابھرتے ہیں جن میں اسلامی صلاحیتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ کیا ایران میں یہی کچھ نہیں ہوا تھا۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ عوام اسلام کی دعوت سے خوش تھے۔ صرف ان فوجی سرداروں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا تھا جو حکمرانوں کے وظیفہ خوار تھے۔ ورنہ عوام مسلمانوں کی مدد کر رہے تھے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ روم اور ایران کے عوام نے مسلمانوں سے تعاون کیا اور ان کا ساتھ دیا۔ عوام کہتے تھے کہ اگر تمہارا نعرہ واقعی اللہ اکبر ہے تو آجاؤ ہمارے سر آنکھوں پر۔

خدا کے نزدیک سب آدمی برابر ہیں اس لیے ہم تمہاری مدد کے لیے موجود

ہیں۔ وہ بھی مسلمانوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہو گئے تاکہ اس فرسودہ اور بدعنوان طبقہ کو ہٹایا جاسکے جس نے لوگوں کی سوچ اور ان کی صلاحیتوں کو دبا رکھا تھا۔ اسکے نتیجے میں یکایک ایرانیوں کی صلاحیتیں بروئے کار آنے لگیں قبل از اسلام اور بعد از اسلام کی ایرانی تاریخ کا ایک ایک ورق الٹ کر دیکھیے۔ یہ سب شعراء، یہ سب علماء، یہ سب مصنفین، یہ سب محققین، یہ سب خطیب یکایک کیسے پیدا ہو گئے۔ یہ اسلام کی برکت تھی جس نے اس گندے معاشرے کو دھو کر صاف کر دیا۔

اسلام کہتا ہے کہ حق کی تبلیغ کرد۔ اگر کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے تو اس رکاوٹ کو دور کر دو۔ اگر مخالفین تم پر حملہ کریں تو تمہیں بھی اپنے دفاع کا حق ہے، ورنہ تمہارا مقصد اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ چونکہ اسلام خدا کا دین ہے، اس لیے ہر مزاحمت اور رکاوٹ کو دور کرنا ضروری ہے۔ دوسرا سوال دفاع کا ہے۔ اگر کفار یا کوئی اور غیر ملکی طاقت کسی مسلمان ملک پر حملہ آور ہو تو اس صورت میں تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسلامی مملکت کا دفاع کریں۔ اسی طرح جنگ کی دو قسمیں ہیں، ایک کا مقصد پیش رفت کرنا ہے جبکہ دوسری دفاعی جنگ ہے۔ جنگ اور جہاد کی ایک اور قسم بھی ہے۔ یہ داخلی جنگ ہے۔ اگر کوئی مذہبی اقلیت اس ملک میں مسلمانوں کی سرپرستی قبول کر کے ذمی کا درجہ حاصل کرلے، جہاں اسلامی حکومت قائم ہو، اسلامی قوانین نافذ ہوں اور اسلامی حدود کا اجرا ہوتا ہو اور جہاں کی حکومت کا کاروبار مسلمان ٹیکس دہندگان کے روپے سے چلتا ہو تو ایسے ملک میں جو یہودی یا عیسائی اقلیت رہتی ہے اس کے بارے میں اسلام کہتا ہے کہ اگر ذمی اپنی ذمہ داری کی حدود میں رہتے ہیں اور اپنے عہد کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وہ بھی کسی مسلمان کی طرح اپنی عبادات آزادی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔ اگر ذمی جزیہ ادا کریں تو

اس کے بعد ان کی جان اور مال بھی اسی طرح محفوظ ہوں گے جس طرح کسی مسلمان کے۔ کسی کو ان کے مال اور آبرو سے تعرض کا حق نہیں ہوگا لیکن اگر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کریں گے تو پھر ذمی نہیں رہیں گے، محارب (جنگجو باغی) بن جائیں گے۔ چونکہ انہوں نے مقررہ حدود سے تجاوز کیا ہے۔ اس لیے ان سے اسلامی مملکت کے اندر اس وقت تک جنگ کی جائے گی۔ جب تک وہ حق اور قانون کی اطاعت اور دوبارہ اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول نہ کرلیں۔ اب یہ ملاحظہ کیجیے کہ اسلامی فقہ کے مطابق ذمی کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور مسلمان کہاں تک ذمی کے ساتھ حسن سلوک کے مکلف ہیں۔ یہ تفصیل ہماری فقہی کتابوں میں موجود ہے۔ میں علامہ حلی علیہ الرحمۃ کی کتاب مختصر نافع سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ذمی ہونے کی شرائط پانچ ہیں:۔

۱۔ ذمی جزیہ ادا کرے یعنی ایک خاص ٹیکس اسلامی بیت المال کو دے تاکہ اس کے حقوق محفوظ ہو جائیں اور مسلمان اس کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔

۲۔ وہ مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔ کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا نہ کرے، مسلمانوں کا مال چوری نہ کرے اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ سانہ باز نہ کرے۔

۳۔ جن کاموں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے ان کا علی الاعلان ارتکاب نہ کرے جیسے شراب نوشی، زنا اور ان عورتوں سے نکاح جن سے اسلام میں نکاح جائز نہیں۔

۴۔ غیر مسلم نئے کلیسا اور کنیسا تعمیر نہ کریں، ناقوس نہ بجائیں اور اس بارے میں عام قوانین پر عمل کریں۔ (اسی ذیل میں گرجا گھروں، مسجدوں اور مکانوں

سے متعلق بحث کی گئی ہے اور ان سے متعلقہ احکام بیان کیے گئے ہیں)
بہر حال غیر مسلم نئی عبادت گاہیں تعمیر نہیں کر سکتے۔ اگر وہ کوئی ایسی عمارت تعمیر کریں گے تو گرا دی جائے گی۔ ان مقامات پر جہاں مسلمانوں کی اذان کی آواز بلند ہوتی ہے، ناقوس کی آواز بلند نہیں ہوتی چاہیے۔

۵۔ ولایُعلی الذمّی بُنیانهٗ فَوقَ المُسلِم۔ کسی ذمی کو یہ حق نہیں کہ وہ مسلمانوں کی عمارتوں سے بلند تر کوئی عمارت تعمیر کرے۔

ہماری شاہراہوں پر یہ کئی منزلہ عمارتیں کس کی ہیں۔ وہ کون ہیں جو اس مملکت میں مسلمانوں کے دشمنوں سے تعاون کر رہے ہیں؟ جبکہ اسلام کا قانون موجود ہے۔ کیا یہ اسلامی فقہ ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ خود اعتراف کریں۔ کون لوگ مسلمانوں کے اموال غصب کر رہے ہیں اور صیہونزم اور دنیا بھر کے یہودیوں کی مدد کرتے ہیں؟ وہ کون ہیں جو مسلمان عورتوں کی بے عصمتی کا سبب بنتے ہیں؟ کیا یہ ذمی ہیں یا محارب؟ اس کے متعلق کوئی فقیہہ ہی فتویٰ دے سکتا ہے۔ علمائے اہل سنت اور علمائے شیعہ نے اس بارے میں جو احکام بیان کیے ہیں، ان کے مطابق اگر کوئی حکومت (ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ہمارے ملک میں یہ صورت نہیں) خود ان معاملات میں ملوث ہو تو مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے؟ اس حکومت کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ اسلامی فقہ کا حکم کیا ہے؟ میں یہ نہیں چاہتا کہ اس حکم کو بیان کرنے میں کسی تعصب سے کام لیا جائے۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو صحراؤں میں دھکیل دیتے ہیں اور اسلامی حدود کو پامال کرتے ہیں۔ دوسری طرف مختلف بہانوں سے مسلمانوں کی دولت پر قبضہ کرتے ہیں اور کر رہے ہیں اور اسے پیداواری اور ترقیاتی کاموں پر خرچ کرنے کے بجائے بے حیائی کو رواج دینے میں صرف کر رہے ہیں۔ میں کسی کا

نام نہیں لیتا۔ اگر کوئی غیر ملکی حکومت آکر سفارت خانہ کھولتی ہے تو اس اسلامی ملک کے اعلیٰ حکام اور وزرا بھی وہاں جاکر کھاتے پیتے، ہنستے بولتے اور عیش کرتے ہیں۔ ایسی حکومت کی نسبت مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ یہ آپ خود طے کیجیے۔

کیا ایسی حکومت کو جو اسلام کے قوانین کے تابع نہیں، مسلمانوں پر حکومت کرنے کا حق ہے؟ آپ غور فرمائیے۔ اگر جھوٹ ہو تو تردید کر دیں۔ اگر سچ ہے تو پھر یہ حالت تو اسلامی اصول سے میل نہیں کھاتی۔ آج صیہونیت استعمار ہی کی دوسری شکل ہے۔ اپنی اصلی شکل میں تو استعمار شکست کھا چکا ہے۔ اب اس نے صیہونیت کا چولا بدلا ہے۔ صیہونیت نے اسرائیل کی شکل اختیار کی ہے۔ ایران میں اسرائیل نے ایک اور بھیس بدل کر بہائیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اگرچہ ایران ایک شیعہ اسلامی ملک ہے مگر یہاں اسلام کے لیے صرف دعائے خیر ہی کی جا سکتی ہے کیونکہ اس ملک کی تمام وزارتوں اور محکموں میں بہائی چھائے ہوئے ہیں۔ حکومت کے جو عہدہ دار پوشیدہ یا ظاہرا طور پر یہاں تشریف فرما ہیں ہیں ان کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ جناب یہ اسلام کا معاملہ ہے، مذہب کا معاملہ ہے اور مذہب یہ چاہتا ہے کہ مملکت کی سربراہی خود اس کے ہاتھ میں ہو۔ سربراہِ مملکت سے اوپر بھی وہ ہو اور نیچے بھی وہی ہو۔ اب آپ خود خیال فرمائیے کہ میں یہ باتیں کر کے آپ کو کیوں پریشان کر رہا ہوں۔ مجھے بات نہ کرنے دیجیے۔ میری زبان بندی کر دیجیے۔ پھر میری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔ لیکن جب میں یہاں آؤں گا تو مجبور ہوں گا کہ اسلامی قوانین بیان کروں۔ میں کسی کا ملازم نہیں ہوں، تنخواہ دار نہیں ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ حکومت کا انتظام میرے حوالے کر دیا جائے۔ میں کوئی خطاب نہیں چاہتا۔ میں جو کچھ بھی ہوں وہی ہوں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں۔

کل سے اب تک مجھے خوب پریشان کیا گیا ہے۔ محض اس لیے کہ کل شام کچھ نوجوان مسلمانوں نے دزاشیب میں ایک مجلس برپا کی تھی۔ دیکھیے یہ کیا مذاق ہے۔ مجھ سے ایک بار ہی صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ منبر پر مت جاؤ۔ مجلس نہ پڑھو۔ یہ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ میں پریشان ہوں۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اس کی ذمے داری خود مجھ پر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کل صاحب خانہ کو پکڑ لو۔ اس سے باز پرس کرو اور اس کی زندگی سے کھیلنے لگو۔ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مجھ سے کہو کہ تم نے جھوٹ کہا۔ تم اسلام کے برخلاف باتیں کرتے ہو۔ تم تخریب کار ہو۔ تم نے غیر ملکی سفارت خانوں کے ساتھ ساز باز کر رکھی ہے۔ جو چاہو کہو۔ میری فرد جرم تیار کر لو۔

عوام کو معلوم ہے کہ میں کیا ہوں۔ اسلامی مملکت کیسی ہوتی ہے؟ کیا یہ لوگ دین پناہ کہلانے کے قابل ہیں؟ موتمرِ اسلامی میں ہم سر اوپر نہیں اٹھا سکے۔ جب ہمیں بتلایا گیا کہ دوسرے ملکوں سے ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہیں۔

جناب وزیرِ زراعت! کیا اس ملک میں کوئی مسلمان مشیر نہیں؟ کیا ہمارے یہاں کوئی انجینئر نہیں؟ اگر نہیں ہے تو سوئٹزرلینڈ سے لے لو، پاکستان سے بلا لو۔ جرمنی سے لے آؤ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ مشیرِ تقسیم اراضی کوئی یہودی صیہونی ہی ہو؟ آخر آدمی کس کس بات کا رونا روئے۔ میں جانتا ہوں اس لیے کہتا ہوں۔ میرے پاس ثبوت بھی موجود ہے۔ تم کہدو کہ یہ جھوٹ ہے۔ ایک مہینہ پہلے جو جشن ہوا، مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہوا تھا۔ اس کے منتظمین کون تھے۔ مجھے ان کے نام معلوم ہیں۔ میں مشیروں کو بھی جانتا ہوں۔ ہمیں اطلاع ملی تھی لیکن میں نے کہا تھا کہ ہمیں کیا، ہم سے مطلب نہیں۔ تم نے دیکھا جب کوئی کہیں سفر

پر جاتا ہے یا سفر سے واپس آتا ہے تو اخباروں میں کتنا چرچا ہوتا ہے لیکن القدس کے بارے میں کانفرنس ہوئی، کسی نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا کہ اس میں کون کون شریک تھا، کیا گفتگو ہوئی۔ اس میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے سوائے اسرائیل کے کارندوں کے؟ وہی اسرائیل کے کارندے جو اس ملک میں اخلاق، عصمت اور عفت، اقتصادیات، ہمت و حوصلہ ہر چیز کو برباد کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ آقائے مطہری نے کہا ان کا حوصلہ ہر خطرے سے بڑھ کر ہے۔ آج میں آپ کو، سب مسلمان بھائیوں کو، علماء کو اور آپ بزرگوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ پھر آپ جانیں اور آپ کا کام یا پھر حکومت ان باتوں کی تردید کرے اور کہدے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ پروپیگنڈا ہے۔ ہمارا سر شرم سے تمام دنیا کے سامنے جھکا ہوا ہے۔

یہ بھی جہاد ہی کا ایک مرحلہ ہے۔ وہ بھی جہاد ہے جو کفار سے اسلام کی پیشرفت کے لیے ہو۔ اسلام اور اسلامی مملکت کا دفاع بھی جہاد ہے۔ ایک جہاد اس کے لیے ہوتا ہے کہ ذمی محارب نہ بن جائے۔ جہاد کی تین قسمیں ہیں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے۔ وہ جنگ جو استبداد اور آمریت کے خلاف لڑی جائے وہ بھی جہاد ہے تاکہ کوئی اسلامی ملک میں من مانی نہ کر سکے۔ طاغوت نہ بن جائے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ مستبد اور آمر کی اصلاح کرے، اسے نیک صلاح دے۔ خود آمریت اور استبداد کوئی اچھی چیز نہیں۔ ملک کے مفاد میں نہیں، معاشرے کے مفاد میں نہیں۔ کوئی آمر ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کو نصیحت کرنی چاہیے۔ اگر نصیحت پر کان نہ دھرے تو پھر اس کے مقابلے میں محاذ آرائی اور طاقت کا استعمال ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ لوگ جو مسلمان ہیں یہ کہیں کہ اگر یہ بات ہے تو علمائے اسلام کیوں جہاد کے بارے میں یہ باتیں بیان نہیں کرتے۔ ہماری

روایات اور احادیث میں اس سے مختلف بیان کیوں ہے۔ جب ہم اسلام کی ابتدائی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ صدر اول میں امیرالمومنینؑ نے ان سب جنگوں کو جن میں مسلمانوں نے شرکت کی درست قرار دیا۔ نہ صرف جہاد میں مدد دی بلکہ بعض جنگوں میں خود اپنے بیٹوں کو بھیجا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے بعد معاویہ اور یزید کا دور آگیا۔ جہاد کے بارے میں جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں جہاد کی شرط یہ ہے کہ امام عادل یا سلطانِ عادل کی قیادت میں جہاد کیا جائے۔ اخبار و احادیث میں یہ تصریح ہے کہ جنگ سلطانِ جائر یا امام جائر کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے نہ ہو۔ اسی لیے حکم ہے کہ سلطانِ عادل کی قیادت میں جنگ اور دفاع کرو۔ ائمہ کے زمانے میں حالات کیا تھے؟ مسلمان لڑتے تھے۔ اسلامی علاقے میں وسعت پیدا ہوتی تھی لیکن اس سے فائدہ کسے پہنچتا تھا؟ اگر کوئی مسلمان جا کر چین کو فتح کر لے اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ عبدالملک بن مروان، سلیمان بن عبدالملک یا کسی عباسی خلیفہ کو اس کا فائدہ پہنچے اور وہ امیرالمومنین اور خلیفۃ المسلمین بن جائے تو اسلام یہ نہیں چاہتا۔ اسی وجہ سے روایات میں سلطانِ عادل پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ یہ ہے اصل بات۔ جس طرح روایات میں نمازِ جمعہ کے متعلق آیا ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ نمازِ جمعہ حکومت کا نشان ہے۔ اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ جو بھی ہو اس کے ساتھ نمازِ جمعہ پڑھنا صحیح ہے تو اس کا مطلب ولید بن عبدالملک کی حکومت کو صحیح قرار دینا تھا۔ متوکل عباسی کی حکومت کو صحیح قرار دینا تھا۔ کسی اموی بچے کی حکومت کو صحیح قرار دینا تھا کیونکہ جمعہ کی نماز کے امام ان ہی کے نمائندے ہوتے تھے۔ جمعہ کی نماز دوسری نمازوں کی طرح کی نماز نہیں ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ اگر تم کو امام عادل ملے تو جمعہ کی نماز پڑھو ورنہ نہ پڑھو۔ کسی جابر حکومت کی تائید اور توثیق مت

کرو لیکن اگر مسلمان خود جمع ہو کر نماز پڑھیں اور یہ مانع موجود نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ نماز جمعہ واجب نہ ہو۔ جب ہم نماز جمعہ کے متعلق اخبار کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کا معاملہ بھی جہاد کا سا ہے۔ ائمۂ اہلبیتؑ فرماتے تھے: آخر کس کے لیے جہاد کرتے ہو؟ اس لیے کہ ان لوگوں کو زیادہ مالِ غنیمت ہاتھ لگ جائے۔ ہارون الرشید کے محل میں عیش وعشرت کے سامان میں اضافہ ہو جائے، گانے والیاں ایک ہزار کی جگہ پانچ ہزار ہو جائیں۔ ائمہ کو یہ اسلام منظور نہیں تھا۔ ایسا اسلام قابلِ قبول نہیں۔ اس طرح کی ترقی کا اسلام کی حقیقت پر پردہ ڈالنے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں۔ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اصلاح کی کوشش کی اور جب چاہا کہ لیٹروں کو روک لگائیں تو ہر طرف سے مخالفت شروع ہو گئی۔ اس وقت شاید ترکستان کے والی نے لکھا تھا کہ لوگ جوق در جوق آرہے ہیں کہ ہم ان کا اسلام قبول کر لیں تاکہ انہیں خراج یا جزیہ نہ دینا پڑے۔ اجازت دیجیے کہ ہم ان کا اسلام قبول نہ کریں تاکہ ان سے جزیہ لیتے رہیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ایک نمائندے کو اس ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ وہاں جا کر اس والی کو کوڑے لگائے اور اسے لکھا کہ: اِنَّ اللّٰہ بَعَثَ مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وآلہٖ ھادیًا وما بعثہٗ جابیًا۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو ہادی بنا کر بھیجا تھا محصّلِ خراج نہیں۔ مصر سے لکھا گیا کہ قبطی آکر مسلمان ہو رہے ہیں، اجازت دیجیے کہ ان کا ختنہ کر دیا جائے۔ جو ختنہ کرا لیں ان کا اسلام ہم قبول کریں اور جو ختنہ پر رضامند نہ ہوں ان سے خراج لیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس موقع پر بھی اپنا نمائندہ بھیجا اور لکھا: اِنَّ اللّٰہَ بَعَثَ مُحَمَّدًا خاتِمًا وما بعثہٗ خاتِنًا۔ خداوند تعالیٰ نے رسولِ اکرمؐ کو خاتم الانبیاءؑ

بنا کر بھیجا تھا اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ لوگوں کا ختنہ کیا کریں۔ غرض فتوحاتِ اسلامی نے یہ صورت اختیار کر لی تھی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک اسلامی ملک دوسرے اسلامی ملک پر حملہ کرنے لگا اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ دوسرے ملک کی دولت پر قبضہ کر کے اسے ہڑپ کر لیں اس لیے ائمہ طاہرینؑ نے فرمایا کہ جہاد صرف اس وقت جائز ہے جب امامِ عادل یا سلطانِ عادل موجود ہو۔ جیسا کہ بعض فقہاؒ نے کہا ہے کہ امام عادل سے مراد امام معصوم ہے تو عادل کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا۔ عدالت اور عصمت میں عموم و خصوصِ مطلق کی نسبت ہے یعنی ہر معصوم عادل ہوتا ہے لیکن ہر عادل معصوم نہیں ہوتا لٰہذا اگر مسلمانوں کی قیادت کسی عادل شخص کے ہاتھ میں ہے تو اس صورت میں جہاد سب پر واجب ہے۔

یہ خود ایسا موضوع ہے کہ میری رائے میں بزرگ علماء، فضلاء اور خطیب حضرات اس پر مزید گفتگو اور تحقیق کریں۔ ایک ایسا مذہب جو برحق ہے اور جس کا اپنا نظام ہے یہ ممکن نہیں کہ اس میں جہاد اور دفاع نہ ہو اور چاہے کوئی کچھ بھی کر گزرے یا اسلام اور مسلمانوں پر کیسی ہی آفت کیوں نہ آئے مسلمان خاموش بیٹھے رہیں اور اسلام کی پیش قدمی کی قوت کو ضائع کر دیں۔ اسلام کو بالکل بے رُوح اور بے دست و پا کر دیں۔ مجھے ایک روایت یاد آئی ہے جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ حضرت امام سجادؑ حج کے لیے جا رہے تھے کہ ایک شخص عباد بصری جس کا کام نکتہ چینی اور بہانہ بازی تھا، حضرت کے پاس آیا اور کہنے لگا ترکتَ الجهادَ وصعوبتهٗ واقبلتَ علی الحجّ ولینهٖ آپ نے جہاد کا مشکل کام تو چھوڑ دیا اور حج کا آسان کام اختیار کر لیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ۔ وَعْدًا عَلَيْهِ

حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

"اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور ان کے مال خرید لیے ہیں جنت کے بدلے ہیں۔ یہ جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ میں۔ سو قتل بھی کرتے ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں۔ یہ اللہ کا سچّا وعدہ ہے تورات میں، انجیل میں، قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہے؟ پس خوش ہو جاؤ کہ تم نے کتنا اچھا سودا کیا ہے۔ یہی دراصل عظیم کامیابی ہے۔" (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۱۱)

حضرت نے کمال متانت سے جو آپ ہی کا حصہ تھا فرمایا کہ پوری آیت پڑھو۔ آیت یہاں ختم نہیں ہوئی۔ باقی آیت بھی پڑھو۔ اس نے آگے پڑھا۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔

"توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، راہِ خدا میں سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کاموں کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور حدودِ الٰہی کی حفاظت کرنے والے۔ خوشخبری دیدیجیے مومنوں کو۔" (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۱۲)

اس آیت کی بنا پر جہاد کی شرط یہ ہے کہ مردِ مجاہد گناہوں سے تائب ہو، عبادت گزار ہو، وطن سے باہر نکلے، راکع و ساجد ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا اور حدود اللہ کا پاس کرتا ہو۔ حضرت نے اس شخص

سے کہا کہ تم نے ان اوصاف کے حامل لوگ کہیں دیکھے ہیں۔ ایسے لوگوں کی ہمراہی میں جہاد حج سے افضل ہے یعنی کس مقصد کے لیے اور کس کی ہمراہی میں کا سوال ہے۔ ائمہ اطہار ؑ کے زمانے میں اس طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ جہاد کے بارے میں ائمہ کے طرزِ استدلال پر غور کرنا اور جو الفاظ انہوں نے استعمال کیے ہیں ان کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ کیا ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے دفاع کی قوت اور ترقی کا جذبہ ختم ہو جائے۔ مسلمان کاسہ لیس بن جائیں، ذلیل ہو جائیں، بے بس اور کمزور ہو جائیں یا یہ مقصد تھا کہ مسلمان بلا وجہ اپنے آپ کو نہ کٹوائیں۔ جب حق واضح ہو، یہ معلوم ہو کہ مدّ مقابل کون ہے جہاد کا نتیجہ کیا ہوگا۔ نیتیں صاف ہوں، جہاد فی سبیل اللہ ہو، تب مسلمانوں کو اٹھنا چاہیے، ورنہ اسلام نے جتنی اہمیت جہاد اور قتال کو دی ہے اس سے زیادہ وہ انسانی جانوں کو قیمتی سمجھتا ہے۔ یہ نہیں کہ لوگ جذبات کی رو میں بہہ کر مارے جائیں یا جوش میں آکر کسی خاص گروہ کے مفاد کے لیے قربانی کا بکرا بن جائیں۔ جب لوگوں سے کہا جائے گا کہ قوم کی حفاظت اور بقا کے لیے یا قوم کی عزت کے لیے مملکت کا دفاع کرو تو ایک مسلمان لامحالہ پوچھے گا: کس کے لیے؟ کون سی مملکت! کیا میں دیوانہ ہو گیا ہوں کہ مملکت کا دفاع اس لیے کروں کہ چند لوگوں کا تسلّط اور مضبوط ہو جائے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ لوٹ مچا سکیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ حق کی حمایت کی خاطر خدا کی راہ میں آگے بڑھو تو میں حاضر ہوں، سینہ سپر ہوں۔ اگر کسی سچے مسلمان سے یہ کہا جائے کہ کیا فلاں مادی مسلک کے لیے لڑو گے جو کھانے اور کپڑے کی ضمانت دیتا ہے تو ظاہر ہے اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ لوگ دنیا کے دیوانے ہیں۔ وہ عاقل لوگ جو ان چیزوں سے بالاتر ہیں اور اسلامی تعلیمات

کے پابند ہیں، ان کا جہاد حق کے لیے اور فی سبیل اللہ ہوتا ہے۔ اسلام نے اس کے لیے سدا قائم رہنے والی راہیں استوار کر دی ہیں۔

یہ چند جملے سید الشہداءؑ کے اس خطبہ کے ہیں جو آپ نے کربلا کے قریب پہنچنے پر ارشاد فرمائے تھے۔ ابو مخنف طبری، عقبہ بن ابی العیزرات سے نقل کرتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ خبر بعض لوگوں کو ہضم بھی ہو سکے گی یا نہیں۔ بہر حال منزل بیضہ میں جب حُر کے سپاہی بھی امامؑ عالی مقام کے پاس موجود تھے آپ نے کھڑے ہو کر یہ چند فقرے کہے، تاکہ آپ کا مقصد سب پر واضح ہو جائے۔ یہ ایک اصولی بات ہے۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا: ايها الناس انّ رسولَ الله صلى الله عليه وآله وسلّم قال ۔ لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ائمہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ کوئی بات خاص اپنے شیعہ اور اپنے پیروکاروں اور معتقدین سے کہتے تھے تو خود اپنی طرف سے بیان کرتے تھے لیکن اگر مخاطب ایسے لوگ ہوتے جو عقیدت مند نہیں یا شک اور شبہ میں مبتلا ہوتے تھے تو وہ رسولِ اکرمؐ کی حدیث نقل کرتے تھے[1]۔ فرمایا۔ رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے کہ:

"جس شخص نے کسی جابر سلطان کو دیکھا کہ وہ ان باتوں کو جو اللہ نے حرام کی ہیں حلال ٹھہراتا ہے، اللہ کے عہد کو توڑتا ہے۔ سنّتِ رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے، خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے اور ان سے توہین آمیز برتاؤ کرتا ہے، اگر اس شخص نے اس کے رویہ کو اپنے قول یا عمل سے بدلنے کی کوشش نہ کی یعنی خاموشی اختیار کی، كانَ حقّاً على الله ان يُّدخِلَهٗ مدخلَهٗ تو اللہ کو حق ہے کہ جہنم کے جس درجے میں چاہئے اس ظالم کو داخل کرلے اور

---

[1] ہر دو صورت میں کلام رسول اکرمؐ کا ہوتا تھا۔

اس سکوت کرنے والے شخص کو بھی اس ظالم کیساتھ جہنم میں داخل کرے کیونکہ اپنے سکوت کی وجہ سے یہ بھی اسکے ظلم اور اس کے جرم میں شریک ہے۔ یہ رسولِ خدا کا فرمان ہے۔"

پھر فرمایا: دیکھو اور آگاہ رہو کہ ان لوگوں نے یعنی حکومت اور اس کے کارندوں نے شیطان کی فرمانبرداری اختیار کر رکھی ہے اور رحمان کی اطاعت چھوڑ دی ہے۔ بداعمالیوں کو علانیہ پھیلا رہے ہیں۔ حدود کو معطل کر دیا ہے۔ عوام کے مال پر قبضہ جما لیا ہے۔ جن کاموں کو اللہ نے حرام کیا ہے وہ انہوں نے حلال کر دیے اور جن کاموں کو اللہ نے حلال کیا ہے وہ انہوں نے حرام کر دیے۔ اگر دوسرے سب مسلمان اس پر خاموش رہیں تو سب سے بڑھ کر یہ میرا فرض ہے کہ میں اس صورتِ حال کو بدلوں۔ پھر آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: تم نے مجھے خطوط لکھے، پیغام بھیجے، تمہارے نمائندے میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ تم نے یہ عہد کیا ہے کہ تم میری مدد کرو گے۔ میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ اب اگر تم اپنے عہد اور اپنی بیعت پر قائم رہتے ہو تو یہ عقل کی بات ہو گی کیونکہ میں حسینؑ فرزندِ علیؑ اور فرزندِ فاطمہؑ بنتِ رسول اللہ ہوں۔ نفسی مع انفسکم۔ اھلی مع اھلیکم۔ میں خود تمہارے ساتھ ہوں اور میرے اہلِ خاندان تمہارے اہل خاندان کیساتھ ہیں۔ ہم اپنے آپ کو تم سے جدا نہیں سمجھتے اور نہ کسی امتیاز کے خواہاں ہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ ہیں۔ جو لوگوں پر گزرے گی وہی ہم پر گزرے گی اور جو ہم پر گزرے گی وہی لوگوں پر۔ ہماری جان لوگوں کی جان کے ساتھ ہے۔ ہم لوگوں پر حکومت کرنا اور ان سے ممتاز ہونا نہیں چاہتے۔ ہم اپنے آپ کو تم ہی میں سے ایک فرد سمجھتے ہیں۔ ہمارے بیوی بچے تمہارے بیوی بچوں ہی کے مثل

ہیں۔ آپ نے یہ کوئی ایسی بات نہیں کہی جس پر کسی کو حیرت ہوتی ہو کیونکہ امام علیؑ کی چند سالہ حکومت کا نمونہ سب کے سامنے تھا۔ جو کوئی امام علیؑ کو کوچہ و بازار میں دیکھتا تھا، کیا وہ ان میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق محسوس کرتا تھا؟ جو شخص ان کے گھر جاتا تھا کیا وہ ان کا گھر اور سامان دوسروں سے ممتاز پاتا تھا؟ کیا ان کے بیوی بچے دوسروں سے ممتاز تھے؟ یہ ہے ایک اعلیٰ نمونہ اسلامی حکومت اور اسلامی حاکم کا۔ یہ حکومت کسی فرد کی نہیں، خدا کی حکومت ہے بنیادی طور پر اسلام میں غیر اللہ کی حکومت ہے ہی نہیں۔ حکومت صرف خدا کی ہے۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۵۷) پیغمبر امام اور ان کے بعد مجتہد، حتیٰ کہ عام مسلمان محض قوانینِ الٰہی کو نافذ کرنے والے ہیں۔ اس لیے آپ نے فرمایا: نفسی مع انفسکم واھلی مع اھلیکم۔ یہ مت سمجھو کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری اور میرے گھر والوں کی جان محفوظ رہے اور میں دوسروں کو کٹوا دوں۔ علیؑ اور معاویہ میں ظاہری فرق بھی تھا۔ معاویہ محاذ سے پیچھے تکیہ لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے قدموں کے نیچے نرم توشک بچھی رہتی تھی۔ ایک طرف گاؤ تکیہ ہوتا تھا۔ سامنے ہر قسم کی مٹھائیاں چنی ہوتی تھیں۔ مٹھائی کھاتے تھے اور ہنستے تھے۔ جن کی قسمت خراب تھی ان کو تلوار کا سامنا کرنے کے لیے بھیج دیتے تھے۔ وہ حکم دیا کرتے تھے جاؤ اور قتل ہو جاؤ۔ علیؑ بھی فرمان صادر کرتے تھے مگر وہ محاذِ جنگ پر خود سب سے آگے رہتے تھے۔ وہ تلواروں اور جگر دوز تیروں کا بنفسِ نفیس سامنا کرتے تھے۔ لوگوں کو نصیحت کرتے تھے، ان کی رہنمائی کرتے تھے اور نعرے لگاتے تھے۔

جب ہم میدانِ صفین کا تصور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ معاویہ اپنی نشست گاہ پر بیٹھے ہوئے لوگوں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ خوش ہیں کہ میں نے ان کو خوب بیوقوف بنایا۔ غلط پروپیگنڈا کر کے سادہ لوح لوگوں کے

جذبات کو ابھار کر مرنے کے لیے محاذ پر بھیج رہا ہوں تاکہ خود آرام سے حکومت کروں۔ علیؑ جب کوئی حکم دیتے تھے پہلے خود آگے بڑھتے تھے۔ یہ ہے نمونہ نفسی مع انفسکم واھلی مع اھلیکم کا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر تم نے بیعت توڑ دی ہے۔ اگر تم اب پشیمان ہو اور اپنے عہد سے پھر گئے ہو تو یہ بھی تم سے کچھ بعید نہیں۔ تم نے میرے والدؑ میرے بھائی اور میرے چچا کے بیٹے مسلم کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا۔ جو تم پر بھروسہ کرے وہ دھوکا کھائے گا۔ اگر تم اپنا عہد نہیں نبھاتے تو کچھ ہمارا ہی نقصان نہیں کرو گے بلکہ خود بھی گھاٹے میں رہو گے۔ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ جو اپنے عہد سے پھرتا ہے وہ خود اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ خدا جلد مجھے تم سے بے نیاز کر دے گا فسیغنی اللّٰہ منکم جب مجھے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے گا۔ بحار الانوار میں مناقب ابن شہر آشوب سے منقول ہے کہ جب حر بن یزید ریاحی نے عبید اللہ بن زیاد کے حکم سے سرزمین کربلا میں آپ کو سواری پر سے اتار دیا اور ہزار سواروں کے لشکر کے ساتھ آپ کے مقابل اترا تو آپ نے قلم اور کاغذ منگایا اور کوفہ کے اشراف اور سربرآوردہ لوگوں کو اس مضمون کا خط لکھا:

منجانب حسینؑ بن علیؑ بنام سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، عبداللہ بن وال اور دوسرے مومنین۔ جن شیعہ سربرآوردہ لوگوں کے نام آپ نے خطوط لکھے تھے، وہ یا تو قید خانے میں تھے یا شہر بدر کر دیے گئے تھے یا کسی اور عذر کی بنا پر آپ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ خط کی عبارت ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ ولقد علمتم تمہیں معلوم ہے: انّ رسول اللّٰہ قال من رای سلطانا الخ شاید تقریر کے وہی فقرے لکھ کر کوفہ

کے لوگوں کو بھیجے تھے۔

اس بحث کا تتمہ شہید کے بارے میں گفتگو سے متعلق ہے۔ شہادت کی شرائط اور اس کے آثار پر بھی فقہ میں مفصل بحث کی گئی ہے۔ جس شخص نے اس کی حقیقت اور اس کے مقصد کو سمجھ لیا اور پھر اس پر ثابت قدم رہ کر جان دی وہ قرآن کی اصطلاح میں شہید ہے یعنی وہ شخص جس نے حق کا مشاہدہ کیا ہو اس کا مارا جانا محض کسی کی غلطی، اشتعال اور جذبات کے بھڑک اٹھنے کا نتیجہ نہ ہو بلکہ حق اور ہدف کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس نے اپنی جان قربان کی ہو۔ ایسا شخص کسی لالچ یا شخصی منفعت کی تمنا میں نہیں بلکہ قربت کے قصد سے جان دیتا ہے۔ وہ ذاتی تمناؤں اور آرزوؤں سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ حق کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حق کے لیے اپنے آپ کو فنا کر دیتا ہے۔ یہی فنا کی حقیقت ہے۔ فنا یہ نہیں کہ صوفی خانقاہ میں بیٹھا ہُو ہُو کرتا رہے اور سمجھ لے کہ میں واصل بحق ہو گیا۔ واصل بحق ہونے کے معنی یہ ہیں:

از پای تا سرت ہمہ نورِ خدا شود
گر در رہِ خدای تو بے پا و سر شوی

شہید اسی کا نام ہے جو حق کے لیے مر مٹے، راہِ حق میں اپنے آپ کو بالکل فراموش کر دے۔ حق کا مشاہدہ کر کے حق کو قائم کرنے کی خاطر جان دینا گوارا کرے۔ ہر مقتول شہید نہیں ہے۔ جو شخص کسی غلطی کی بنا پر یا کسی ایسے کام کے لیے مارا جائے جس میں دنیا داری کا پہلو ہو وہ تو خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ۔ کا مصداق ہے۔ شہید وہ ہے جو دین کمائے، خدا کو پہچانے، جس کا آخرت پر اعتقاد ہو، بقاء پر اعتقاد ہو، ہدف اور مقصد کو اچھی طرح

سمجھ کر دنیوی تعلقات سے منہ موڑ لے۔ چونکہ ایسا شخص حق کا مشاہدہ کرتا ہے اس لیے وہ مرنے سے نہیں ڈرتا۔ موت اس کے لیے آسان ہے۔ بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ نماز میں قطب کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ انسان چونکہ مادی ہے وہ خدائے مطلق کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا اس لیے خدا کی طرف توجہ کے لیے کسی مادی مظہر کا سہارا لینا چاہیے۔ یہ صوفیاء کی غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بتدریج مادی حدود سے نکل کر ہی مطلق کی طرف توجہ ممکن ہے۔ البتہ ضمناً ہم ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ کرتے چلیں کہ ہم نماز میں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ۔ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ کے بعد ہمیشہ یہ کہتے ہیں صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ یعنی اے اللہ ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن کو تو نے اپنی نعمتیں دی ہیں۔ کون سی نعمتیں؟ کیا مال و دولت اور طاقت اور قدرت؟ ایک دوسری آیت میں ہے: وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ آگے ان انعام یافتہ گروہوں کی تفصیل ہے۔ پہلے اَلنَّبِیّٖنَ دوسرے درجہ میں اَلصِّدِّیۡقِیۡنَ یعنی جنہوں نے اپنے دل و دماغ سے حق کا مشاہدہ کر کے اس کی جان و مال سے تصدیق کی۔ وَالشُّہَدَآءِ۔ یعنی جو راہِ حق میں شہید ہوئے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ وَالصّٰلِحِیۡنَ۔ وہ جو پہلے تین گروہوں کے بعد آتے ہیں اور اپنی زندگی میں ان کا اتباع کرتے ہیں۔ یہ چار گروہ ہیں جن کو اللہ نے اپنی تمام نعمتوں سے نوازا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ اور ان ہی کے ہمقدم ہیں۔

شہداء میں چونکہ ایک باطنی انقلاب ظہور پذیر ہوتا ہے۔ وہ حق کا

مشاہدہ کرتے اور راہِ حق میں مارے جاتے ہیں۔ اللہ نے بھی ضمانت دی ہے کہ وہ ان کے وجود کو باقی رکھے گا۔ کیا آپ کو اس پر حیرت نہیں کہ کچھ لوگ دنیا کے ایک گوشے میں جمع ہوئے۔ دشمنوں نے ان کی آواز بھی باہر نہیں نکلنے دی بلکہ ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کا محاصرہ کر لیا۔ ان کو قتل کر دیا۔ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ ان میں سے کسی کو بھی باقی نہیں چھوڑا کہ دوسرے مقامات پر جا کر لوگوں کو خبر کر دے کہ قصہ کیا تھا۔ اس کے باوجود مخلوقِ خدا نے ان کے نام، ان کے کام اور ان کے آثار کو باقی رکھا۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے؟ کیا یہ حق کا ظہور نہیں کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں ان کی تاریخ اتنی تفصیل سے باقی اور زندہ ہے۔ ان کے والدین کے نام، ان کی بیویوں کے نام حتیٰ کہ ان کے گھوڑوں کے نام نیز ان کے وہ الفاظ جو انہوں نے میدانِ جنگ میں کہے تھے، سب زندہ و پائندہ ہیں۔

یہ تفصیل کہاں سے آئی اور کیوں کر باقی رہ گئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فنا کے درجہ سے گزر کر بقا کی منزل کی طرف چلے گئے تھے۔ ارتقاء اور روحانی سیر کی بنیاد یہی ہے۔ سبزہ بھیڑ کے پیٹ میں جا کر گوشت پوست اور ہڈیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور بھیڑ کا گوشت آدمی کے پیٹ میں جا کر فکر و ادراک اور طاقت اور ایمان میں بدل جاتا ہے۔ اگر کسی عالی قدر انسان کے پیٹ میں جاتا ہے تو ارادے، طاقت اور ایمان اور ایسی ہی دوسری صلاحیتوں میں بدلتا ہے جو جاوداں ہیں۔ معلوم ہوا قربانی ارتقاء کی ایک منزل ہے۔

از جمادی مُردم و نامی شدم
پس چہ ترسم کی ز مُردن کم شدم

رومی کہتے ہیں جمادات کی حیثیت سے فنا ہونے کے بعد ہی مجھ میں

نمو کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ پھر میں کیوں ڈروں کہ مر کر فنا ہو جاؤں گا۔

جو آدمی اپنے آپ کو ایک ارفع حقیقت کے لیے قربان کرتا ہے وہ ضرور باقی رہتا ہے۔ پس چہ ترسم کی ز مردن کم شدم۔ بلکہ:

بار دیگر تا بمیرم از بشر
پس برآرم با ملائک بال و پر

اگر میں ایک دفعہ اور بحیثیت انسان کے مر جاؤں تو پھر ممکن ہے کہ میں عالم ملکوت تک پہنچ جاؤں اور فرشتوں کے سے بال و پر پیدا کروں۔

ان لوگوں نے روزِ عاشورا بال و پر پیدا کر لیے تھے۔ گویا ان کی شخصیت مستحکم ہو گئی تھی۔ ایک نے کہا ابو عبداللہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں میدان میں جاؤں۔ دوسرے نے کہا مجھے اجازت دیجیے کہ میں جان پر کھیل جاؤں۔ ولقد ضاق صدری من الحیاۃ۔ مجھے اب مزید جینے کی آرزو نہیں ہے۔ وہ اسطرح کے لوگ تھے۔ ان کے بھی بیوی بچے تھے، عزیز رشتہ دار تھے۔ ان کی بھی اپنی ضروریات تھیں۔ زہیر بن قین بجلی کو لیجیے۔ دو دن پہلے تک وہ خونِ عثمان کے بدلے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ معاویہ اور ان کی حکومت کے پروپیگنڈے سے متاثر تھے۔ آلِ علیؑ کو کسی اور ہی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اتفاقاً راستے میں ملاقات ہو گئی۔ حسینؑ بن علیؑ کے خیمے میں گئے۔ معلوم نہیں کیا بات ہوئی۔ معلوم نہیں ان میں حسینؑ بن علیؑ نے کون سی بجلی کی لہر دوڑا دی کہ سب دنیاوی تعلقات کو جلا کر خاک کر دیا۔ تھوڑی دیر پہلے زہیر کے مال مویشی ان کے پاس تھے جن میں اونٹ، بھیڑ بکریاں اور گائیں تھیں۔ ان کا قبیلہ تھا۔ وہ مالدار تھے۔ اب ان سب چیزوں سے ایک دم دستبردار ہو گئے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ میری شکل تک بدل گئی۔ آخر ہم لوگ اتنے مردہ دل

کیوں ہیں۔ یہی نہ کہ ہمارا کوئی ہدف نہیں۔ چونکہ کوئی ہدف نہیں اس لیے سمجھتے ہیں جو کچھ ہے دولت اور طاقت ہی ہے۔ چاہے جس طرح بھی ہاتھ آئیں۔ اگر یہ میسر نہیں تو زندگی تلخ ہے۔ تاجر ہو، صنّاع ہو یا حکومت کا کوئی عہدہ دار، شام کو جب گھر لوٹتا ہے تو اس قدر تھکا تھکا سا اور منہ بنائے ہوئے ہوتا ہے کہ اس کے بیوی بچوں کو بھی اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی کیونکہ اس کو وہ سب کچھ نہیں مل سکا جو وہ چاہتا تھا۔ وہ کیا چاہتا تھا۔ فوجی ہو یا سول ملازم ہر ایک یہی کہتا ہے کہ آج یا اس سال میرے سب ساتھیوں کی ترقی ہو گئی۔ میری نہیں ہوئی۔ سب کا درجہ بڑھ گیا۔ میرا نہیں بڑھا۔ فلاں شخص کی آمدنی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میری وہی حالت ہے۔ مالی حالت خراب ہے۔ یہ سب افسردہ ہیں۔ الکساٹ چھائی ہوئی ہے۔ دل بجھے ہوئے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ دنیا کے بندے بنے ہوئے ہیں۔ آئیے شہید بنیں تاکہ دنیا پر غالب آجائیں۔ مومن کے یہی معنی ہیں۔ یہی زہیر جب امام حسینؑ کے پاس گئے تھے تو افسردہ خاطر تھے۔ تذبذب میں مبتلا تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ زندگی کے کیا معنی ہیں اور علیؑ حق پر ہیں یا معاویہ؟ انہیں طرح طرح کے وسوسے ستاتے تھے۔

وہ تذبذب کی حالت میں دن بسر کرتے تھے۔ حسرتیں، آرزوئیں پیسے ڈالتی تھیں۔ مکروہات زمانہ سے دم لینے کی فرصت نہیں تھی لیکن جب وہ واپس آئے، ان میں زندگی کی نئی لہر دوڑ رہی تھی۔ سب شبہات رفع ہو چکے تھے۔ انہوں نے سب تعلقات سے منہ موڑا اور شہید ہو گئے۔ وہیں شہید ہو گئے۔ مقتول ہونے سے پیشتر ہی۔ اس کو کہتے ہیں شہید۔ ان کے دل کی کلی کھل گئی۔ زندگی آسان ہو گئی۔ اب جب کہ حق بات سمجھ میں آ گئی، ان کو اور کسی

بات کی پروا نہیں رہی۔ مارے جائیں تو مارے جائیں، زندہ رہیں تو زندہ رہیں۔
جب وہ اپنے خیمہ میں واپس پہنچے تو انھوں نے اپنی بیوی سے جن کا نام تاریخ میں بنتِ عمرو درج ہے، کہا: اٹھو! جاؤ اپنا کام کرو۔ میرا تو کام ختم ہوگیا۔ گائیں، بھیڑ بکریاں اور اونٹ سب تمہارے ہیں۔ میرے لیے اب ان میں کوئی کشش نہیں رہی۔ زہیر چلتے رہے۔ اب شبِ عاشور ہے۔ لو صبح عاشور ہوگئی۔ عاشور کی سہ پہر آگئی۔ ان کے بدن سے خون ٹپک رہا ہے۔ ہونٹوں پر پیاس سے پپڑی جمی ہے۔ حسینؑ کے پاس آئے۔ ابوعبداللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ان کو دیکھتے ہی آنکھیں بند کرلیں۔ کیا دیکھا ہمیں نہیں معلوم۔ کیا مطلب تھا ہم نہیں سمجھ سکتے۔ کیا زہیر دیوانے تھے۔ کیا ان لوگوں کو دیوانہ کہا جاسکتا ہے۔ زہیر نے ابوعبداللہ کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا: فدتك نفسي هاديًا مهديًا۔ میری جان آپ پر قربان۔ آپ نے مجھے نجات دی۔ آپ نے مجھے آزاد کردیا۔ دنیا کی خواہشوں سے آزاد کردیا۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔ ان کے بدن سے خون بہہ رہا ہے اور وہ کہہ رہے ہیں مجھے افسوس نہیں۔ انکے بچے یتیم ہوا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں افسوس نہیں۔ ان کی بیوی بیوہ ہوا چاہتی ہے مگر وہ کہتے ہیں کوئی افسوس نہیں، اس قدر انہیں اپنے اوپر اختیار ہے۔ پھر کہتے ہیں افسوس کیوں ہو؟ اليوم القى جدّك النبيّا وحسنًا والمرتضىٰ عليًّا۔

آج ہی آپ کے نانا رسولِ خداؐ سے ملوں گا۔ حسنؑ اور علی مرتضیٰؑ سے ملوں گا۔ اب فاصلے ختم ہو رہے ہیں۔ یہ میرا بدن خاک و خون میں مل رہا ہے۔ یہ تھا اعتقاد حقیقت کی بقاء اور انسانیت کے راز پر۔ آپ کے نانا کی ملاقات کو جارہا ہوں۔ آپ کے بھائی اور والد سے ملاقات کرونگا۔

ابو عبداللہ کے سامنے ہی گر پڑتے ہیں قتل کر دیے جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ان کی بیوی کوفہ چلی گئی تھی مگر منتظر تھی کہ زہیر کی کیا خبر آتی ہے۔ آخر سنا دنی آ ہی گئی، سب مارے گئے۔ حسینؑ قتل ہو گئے۔ ان کے بچے قتل ہو گئے۔ ان کے بھائی قتل ہو گئے۔ ان کے ساتھی قتل ہو گئے۔ اپنے غلام کے ہاتھ میں کفن دے کر کہتی ہے کہ جا کر اپنے آقا کا کفن دفن کر۔ جب غلام آیا تو اسے شرم آئی۔ اس نے کفن دفن کچھ نہیں کیا۔ شاید واپس چلا گیا۔ جب اس کی مالکہ نے اس سے پوچھا کہ اپنے آقا کو دفن کیا کہ نہیں؟ کفن پہنایا یا نہیں۔ شاید اس نے یہ جواب دیا ہو: کیسے دفن کرتا؟ میں نے جا کر یہ منظر دیکھا کہ جگر گوشہ ہائے رسولؐ اور فرزندانِ فاطمہؑ کے جسموں کے ٹکڑے کربلا کی تپتی ہوئی زمین پر خاک اور خون میں تھڑے پڑے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ان جسموں کو اس حالت میں چھوڑ دیتا اور اپنے آقا کا کفن دفن کرتا۔[1]

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ!

---

[1] تذکرہ ابن جوزی میں ہے: جب زہیر ابن قین امام حسینؑ کی ہمراہی میں شہید ہو گئے، ان کی زوجہ نے اپنے غلام سے کہا کہ جا کر اپنے آقا کو دفن کر دے۔ غلام آیا تو اس نے دیکھا کہ حسین علیہ السلام تن برہنہ زمین پر پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے دل میں کہا: کیا میں اپنے آقا کو دفن کر دوں اور حسینؑ کو ایسے ہی چھوڑ دوں؟ اس نے پہلے حضرت کو کفن پہنایا، پھر اپنے آقا کو ایک اور کفن پہنایا۔ مگر فقہاء کہتے ہیں کہ شہید کو اس کے خون آلودہ کپڑوں ہی میں دفن کرنا چاہیے۔ اسے کفن کی ضرورت نہیں۔

(ڈاکٹر ابراہیم آیتی)

امام حسینؑ کے قیام کے محرکات

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا۔ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ - فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ۔ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ - یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

میں سب سے پہلے ان محترم سامعین سے معذرت خواہ ہوں جو مناسب جگہ نہ مل سکنے کی وجہ سے کھڑے ہوئے ہیں یا زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آٹھویں کی شب کو "وہ اسباب جنہوں نے امام حسینؑ کو قیام پر مجبور کیا" کے عنوان پر کچھ مطالب عرض کیے تھے۔ آج "امام حسینؑ کے قیام کا محرک" کے عنوان سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاید یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ آٹھویں شب

کی اور آج کی تقریر کا موضوع در اصل ایک ہی ہے۔ گو اشتہارات میں دو مختلف عنوان دیئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عنوان کی عبارت خود میری تجویز کی ہوئی نہیں ہے بلکہ میں نے تقریر کا موضوع مجمل طور پر بتلا دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ جن الفاظ میں مناسب سمجھیں اس کا اعلان کر دیں۔ چنانچہ مکتبِ توحید نے اپنے اشتہار میں تقریر کا عنوان وہ دیا اور انجمن مہندسین اسلامی نے اپنے اشتہار میں یہ عنوان دے دیا۔ یہاں یہ کہنا مناسب ہو گا کہ

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرٗ

(تیرا حسن تو وہی ایک ہے۔ ہم اپنے اپنے الفاظ میں اسکو بیان کرتے ہیں لیکن ہر شخص کا اشارہ اسی ایک حسن ہی کی طرف ہے)۔

خدا کرے امتِ مسلمہ اپنے ہر اقدام اور ہر تحریک کے ہر مرحلے میں اسی شعر کا مصداق ہو:

عباراتُنا شتّٰی وَحُسْنُكَ واحد
وكُلٌّ الیٰ ذاكَ الجمالِ يُشيرٗ

آٹھویں کی شب میں جو مضمون میں نے بیان کیا تھا مختصراً اس کا دہرانا ضروری ہے۔ میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ آج کے وہ سامعین جو اس دن موجود نہیں تھے اس نکتہ کی طرف توجہ نہ کریں جو میرے خیال میں بہت اہم ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بعض دانشور حضرات اہلِ علم اور اعلیٰ پایہ کے مصنفین پر حیرت ہے کہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ اگر یہ پوچھا جائے کہ امام حسینؑ نے یزید بن معاویہ کی بیعت کیوں نہیں کی اور ایسا تند و تیز قیام کیوں کیا جس کے نتیجے میں وہ خود اور ان کے اصحاب شہید اور اہل بیتؑ اسیر ہو گئے تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ امام حسینؑ کو بنی سفیان کی حکومت اور اس

وقت کے عوام کے بارے میں جو تجربہ تھا کہ یہ لوگ آپ کے والد امیرالمومنین امام علیؑ اور آپ کے بھائی امام حسنؑ کے ساتھ جس طرح پیش آئے تھے، اس کی بنا پر آپ کو یقین تھا کہ اگر آپ اطاعت قبول کر کے بیعت بھی کر لیں تو بھی آخر کار آپ کو قتل ہی کر دیا جائے گا اور اگر اطاعت قبول نہ کریں تو اس صورت میں بھی قتل سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ چونکہ قتل ہو جانے کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں تھی، اس لیے اس بے بسی کے عالم میں آپ قتل ہونے کے لیے تیار ہو گئے (مجھے ان الفاظ پر سخت شرمندگی ہے)۔ اس رات میں نے تفصیل سے عرض کیا تھا کہ اس طرح کی بات بالکل بے اصل، بے بنیاد اور ابو عبداللہ علیہ السلام کی مقدس تحریک کی شان کے قطعاً منافی ہے۔ یہ بات جس نے بھی کہی ہو، بے اصل اور پھسپھسی ہے۔ اگر واقعی یہی بات تھی کہ حسینؑ کے لیے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی اور اگر وہ اطاعت قبول کر لیتے جب بھی انہیں زہر دے کر یا اور کسی طرح ہلاک کر دیا جاتا، اس لیے اور کوئی چارۂ کار نہ پا کر انہوں نے قتل ہونا منظور کر لیا تو پھر سید الشہداءؑ کے اس عمل کی قدر و قیمت کیا رہ جاتی ہے اور یہ کیوں کر ممکن ہے کہ دنیا ان کی اس مقدس تحریک کو تاریخ اسلام کی تمام مقدس تحریکوں کا نقطۂ عروج اور تمام دینی تحریکوں کا مرکزی نقطہ مان لے۔ خواہ وہ تحریکیں حسینؑ سے پہلے کی ہوں یا بعد کی۔

بات یہ نہیں ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا در اصل امام حسینؑ نے ۶۰ھ اور ۶۱ھ کے اوائل میں اسلامی معاشرے کی حالت کے بارے میں یہ اندازہ لگایا کہ مسلمانوں میں ایسا سخت بگاڑ پیدا ہو گیا ہے کہ اب صورتِ حال کی اصلاح اور اس خطرناک اجتماعی خرابی کو دور کرنے کی اس طرح کے قیام اور اس طرح کی مقدس تحریک کے سوا کوئی صورت باقی نہیں ہے کہ امام حسینؑ

یہ محسوس کر رہے تھے کہ دینِ اسلام اور امتِ مسلمہ کا زندہ رہنا ایک خونی قیام کے بغیر ممکن نہیں اس لیے ضروری تھا کہ وہ اِنَّ اللّٰہَ شَاءَ اَنْ یَّرَاكَ قَتِیْلاً کے مطابق شہید ہوں اور انّ اللہ شاء ان یراھنّ سبایا کے مطابق ان کے وہ عزیز اور وہ بہنیں جن کو عالم اسلام کا بہترین خطیب کہا جاسکتا ہے جن میں ایک کا نام زینبؑ ہے، ایک کا نام امّ کلثومؑ ہے، ایک کا نام فاطمہ بنت الحسینؑ ہے، ایک اور نام علیؑ ابن الحسینؑ کا ہے، یہ سب قیدی بن جائیں اور بازاروں میں پھرائے جائیں جہاں وہ امتِ مسلمہ کو اس وقت کی شرمناک صورتِ حال کی طرف توجہ دلائیں، مسلمانوں کو مرگ و نابودی کے خطرے سے ہمیشہ کے لیے نجات دلائیں، اس مقدس تحریک کو جو حسینؑ ابن علیؑ سے پہلے بھی موجود تھی زندہ رکھیں اور آئندہ کی مقدس تحریکوں کے لیے راہ ہموار کریں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ سے پہلے کی تحریکوں کی طرف بھی اگر ممکن ہو تو اشارہ کردوں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم تحریکِ کربلا کے اسباب و محرکات کا خود سید الشہداءؑ کی تقریروں اور تحریروں سے استنباط کریں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ امام حسینؑ کے قیام کے اسباب آہستہ آہستہ عثمانی خلافت کے اواخر سے پیدا ہونے شروع ہوگئے تھے۔ اس ضمن میں، میں نے کچھ مستند تاریخی حوالے بھی دیے تھے اور امام حسینؑ کی تقریروں اور تحریروں کے بعض اقتباسات کی تشریح بھی کی تھی جن سے ان اسباب پر روشنی پڑتی ہے جنہوں نے امام حسینؑ کو قیام پر مجبور کیا۔ ترتیب وار مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ساتویں ذی الحجہ ۶۰ھ ہجری کو حسینؑ بن علیؑ نے حجاجِ خانہ کعبہ کے سامنے ایک تقریر کی جس میں کسی حد تک اپنی تحریک کی وضاحت کی۔ میں نے کہا تھا کہ یہ قیام ایسا نہیں تھا کہ اس میں چندہ دے کر یا تقریر کر کے یا کوئی دینی اخبار یا رسالہ

لوگوں تک پہنچا کر تعاون کیا جا سکے۔ تعاون کی ایک ہی صورت تھی، اور وہ تھی شہادت اور جاں نثاری۔ میں نے گفتگو تقریباً اس پر ختم کی تھی کہ امام حسینؑ نے اپنی تقریر کے آخر میں فرمایا تھا: من کان باذلاً مهجته وموطناً علی لقاء الله نفسه فلیرحل معنا فانّی راحلٌ مصبحاً ان شاءَ الله۔

یعنی میں تاجروں اور سوداگروں سے مالی امداد نہیں چاہتا۔ مجھے انشا پردازوں کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف ایسے لڑنے والے درکار ہیں جو خدا کی راہ میں جان قربان کرنے پر خلوصِ دل سے آمادہ ہوں۔ اس طرح ہم اس تاریخی سفر کے دوران میں جو ہم نے آٹھویں کی شب میں شروع کیا تھا، مکہ معظمہ اور ساتویں ذوالحجہ تک پہنچے تھے۔ اب میں آپ کی اجازت سے ایک قدم پیچھے ہٹتا ہوں لیکن ایک قدم پیچھے ہٹنے کا مقصد بقول شخصے دو قدم آگے بڑھنا ہے۔ انشاءاللہ۔ میں مدینہ واپس چلتا ہوں اور وہ فقرہ نقل کرتا ہوں جس میں سید الشہداءؑ نے خود اپنے قیام کا مقصد زیادہ صریح اور واضح الفاظ میں بیان کیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مدینہ کے والی ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے یزید کے حکم سے حسینؑ بن علیؑ پر بیعت کے لیے دباؤ ڈالا تھا۔ یہ واقعہ رجب کی ستائیسویں تاریخ کو رات کے وقت ولید کے گھر پہ پیش آیا۔ سید الشہداءؑ نے بیعت نہیں کی تھی بلکہ یہ وعدہ کیا تھا کہ میں اس بارے میں اپنی قطعی رائے کل پرسوں بتلاؤں گا۔ اگلے دن عبداللہ بن زبیر توڑ رکے مارے مدینہ سے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن حسینؑ بن علیؑ ۲۸ رجب سنہ ۶۰ ہجری کی رات تک مدینہ میں رہے۔ سید ابن طاؤس اپنی کتاب لہوف میں لکھتے ہیں کہ صبح ہوئی تو امام حسینؑ اپنے گھر سے یہ معلوم کرنے کے لیے نکلے کہ دیکھیں سیاسی صورتِ حال کیا ہے اور معاویہ

کی موت، یزید کی جانشینی اور ولید کے حسینؑ بن علیؑ سے بیعتِ یزید کا مطالبہ کرنے پر عوام میں کیا ردِ عمل ہوا۔ فلقیہ مروان گلی میں مروان بن حکم مل گیا اس دن ماہِ رجب کی ۲۷ تاریخ تھی۔ فقال له یا ابا عبد الله انی بك ناصح فاطعنی ترشد۔ ابوعبداللہ میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں۔ اگر آپ میری بات مان لیں گے تو اچھا ہی ہو گا۔ عجب جسارت آمیز طرزِ گفتگو تھا۔ فقال الحسین وماذاك قل حتی اسمع۔ امام حسینؑ نے کہا: کہو کیا مشورہ ہے میں بھی تو سنوں۔

مروان نے کہا: اٰمُرُكَ ببیعة یزید بن معاویه فانه خَیرٌ لك فی دینك ودُنیاك۔ اس گستاخ کی جسارت دیکھیے، کہتا ہے کہ اے حسینؑ بن علیؑ میں مروان بن حکم تم کو حکم دیتا ہوں کہ یزید بن معاویہ کی بیعت کر لو۔ اس کی خلافت، امامت اور سربراہی کو تسلیم کر لو اور اس کو امت کے سربراہ کی حیثیت سے قبول کر لو۔ فانّه خیرٌ لك فی دینك ودُنیاك۔ کیونکہ میرے یعنی مروان بن حکم کے خیال کے مطابق اس میں تمہارے دین کی بھلائی بھی ہے اور دنیا کی بھی۔ اگر تم یزید کی بیعت نہیں کرو گے اور اس شرابی کی اطاعت قبول نہیں کرو گے تو تمہارا دین بھی برباد ہو جائے گا، جبکہ دنیا تو خراب ہونا ہی ہے۔

فقال الحسینُ علیه السلام۔ حسین علیہ السلام نے فرمایا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ یہ کلمۂ استرجاع کسی مصیبت یا آفت کے آنے پر پڑھا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کیا المیہ تھا۔

میرے خیال میں وہ زبردست المیہ جس کی وجہ سے حضرت امام حسینؑ نے انا للہ پڑھی، وہ مسلمانوں کا فکری انحراف تھا۔ صحیح ڈگر سے اس قدر دور

ہٹ گئے تھے کہ مروان کہتا ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ کا دین اور ان کی دنیا جب ہی محفوظ رہ سکتے ہیں جب وہ یزید کی بیعت کرلیں۔ اس کے بعد امام نے فرمایا: "وعلی الاسلام السلام"۔ یہ وہ فقرہ ہے جو ان تمام فقروں سے بڑھ کر امام کے قیام اور ان کی تحریک کے راز کی پردہ کشائی کرتا ہے جو میں نے آٹھویں کی شب کو نقل کیے تھے۔ میں نے کہا تھا، امام حسینؑ نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروں۔ شاید کسی کو خیال ہوا ہو کہ حسینؑ یہ چاہتے ہیں کہ جاکر کوفہ کے سبزی فروشوں سے کہیں کہ کم مت تولو۔ وہاں کے تاجروں سے کہیں کہ سود مت کھاؤ۔ کوفہ کے واعظوں سے کہیں کہ منبر پر جھوٹی باتیں مت سناؤ۔ میری تیری خوشامد مت کرو۔ لوگوں کا وقت بے بنیاد باتوں میں ضائع مت کرو۔ مگر حسینؑ بن علیؑ جو کام کرنا چاہتے تھے، وہ یہ نہیں تھا۔ ان کے سامنے جو مسئلہ تھا وہ اس سے بہت اہم تھا۔ یہ کام تو شہر کے واعظ بھی انجام دے سکتے تھے۔ جو کام حسینؑ بن علیؑ کرنا چاہتے تھے وہ تو یہ تھا کہ امت مسلمہ کی افسوسناک حالت کو سدھارا جائے اور ایک تندوتیز قیام کے ذریعے سے معاشرے کے غیر معمولی بگاڑ کی اصلاح کی جائے۔ اس جملے سے ایک حد تک امام حسینؑ کے قیام کے محرکات پر روشنی پڑتی ہے۔ وعلی الاسلام السلام اذ قد بلیت الاُمّة براعٍ مثل یزید ولقد سمعتُ جدّی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یقولُ الخلافة محرّمة علی آلِ ابی سُفیان۔ آپ نے فرمایا اسلام پر سلام یعنی اسلام کو تو خدا حافظ کہنا چاہیے اگر واقعی نوبت یہ آگئی ہے کہ امت کا رہبر اور مسلمانانِ عالم کا سربراہ اور قائد بالفاظِ دیگر امام، یزید بن معاویہ جیسا شخص بن گیا حالانکہ میں نے اپنے نانا خاتم الانبیاءؐ سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ خلافت آلِ ابی سفیان پر

حرام ہے کیونکہ وہ اس قابل نہیں کہ مسلمانوں کے سربراہ بنیں اور ان پر حکومت کریں۔ وَطَالَ الحدیث بینہٗ وبین مروان۔ اس پر حضرت امام حسینؑ اور مروان کے درمیان بات بڑھ گئی حتّٰی انصرف مروانُ وھو غضبان آخر گرماگرم گفتگو کے بعد مروان غصے میں بھرا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اسی طرح کی بات ہمیں ایک اور جگہ پر بھی ملتی ہے۔ یہ امام حسینؑ کا ایک خط ہے۔ اہلِ کوفہ نے امامؑ کی خدمت میں اپنے تمام خطوط تین قسطوں میں مکہ معظمہ بھیجے تھے۔ یہ نکتہ بھی اس سلسلے میں یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ تمام خطوط جو اہلِ کوفہ نے بارگاہِ سید الشہداءؑ میں بھیجے تھے اور جن میں ان کا ساتھ دینے اور آپ کی مقدس تحریک کی حمایت کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی تین قسطوں میں پہنچے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی متفرق خط نہیں تھا۔ خطوط کی ایک کھیپ رمضان کی دس تاریخ کو پہنچی۔ دوسری بارہ کو اور تیسری کے متعلق مجھے کوئی تصریح نہیں ملی کہ کب پہنچی۔ البتہ یہ تصریح ہے کہ دوسری کھیپ کے دو دن بعد تیسری کھیپ کوفہ سے بھیجی گئی۔ قاعدے کی رو سے دوسری کھیپ کے دو ہی دن بعد اس کو مکہ پہنچنا چاہیے تھا۔ اس بات کا ایک اور بھی ثبوت موجود ہے مگر اس کی تفصیل بیان کرنے کا اس وقت موقع نہیں۔ بہرکیف قاعدہ کی رو سے اہلِ کوفہ کے خطوط کی تیسری کھیپ ۱۴ ررمضان ۶۰ھ کو پہنچی ہوگی۔ اس طرح تین دفعہ کر کے اور چھ روز کے اندر اہلِ کوفہ کے تمام خطوط اور عہد نامے اور اقرار نامے پہنچے اور اسی اثناء میں امام حسینؑ نے بھی مسلم بن عقیل کو عراق بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ مسلم بن عقیل کی روانگی کی تاریخ قطعی طور پر معلوم ہے۔ یہ تاریخ ۱۵ ررمضان تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ کوفہ کے خطوط کی آخری کھیپ کے پہنچنے کے ایک دن بعد آپ نے مسلم کو کوفہ بھیجا۔ اب یہ ایک خط ہے جو امام حسین علیہ السلام نے مسلم بن عقیل کو عراق بھیجنے سے پہلے

اہل کوفہ کے خطوط کے جواب میں سعید بن عبداللہ حنفی اور ہانی بن ہانی سبیعی کے ہاتھ ارسال کیا تھا۔ یاد رہے کہ ان میں سے اول الذکر یعنی سعید بن عبداللہ شہدائے کربلا میں سے ہیں۔

اس خط میں بھی حسینؑ بن علیؑ اپنی تحریک کا راز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: فلعمری ما الامامُ الاّ الحاکِمُ بالکتاب اپنی جان کی قسم! امام وہی ہوتا ہے جس کا ہر فیصلہ قرآن کے مطابق ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس قیام اور تحریک کا مقصد عراق کے دستکاروں کو مسائل اور احکام سکھانا نہیں ہے۔ معاملہ کچھ اور ہے۔ اسلامی حکومت اور مسلمانانِ عالم کی حالت کچھ ایسی دگرگوں ہو چکی تھی کہ امام حسینؑ جیسی شخصیت کے قیام کے علاوہ اس کی اصلاح کے لیے کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی تھی۔ آپ نے لکھا کہ فلعمری ما الامام الاّ الحاکِمُ بالکتاب القائم بالقسط۔ چاہے "امام" کا لفظ آئے یا راعی (لفظی معنی چرواہا) کا لفظ آئے، یا "مولا" کا لفظ استعمال ہو جیسے کہ اس حدیث میں کہ "من کنتُ مولاہ فھذا علیؑ مولاہ"۔ یا سلطان کہا جائے دین کی زبان میں ان سب سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو رسولِ اکرمؐ کے جانشین کی حیثیت سے امتِ مسلمہ پر حکومت کرے۔ اس کے فیصلوں کا دارومدار قرآن پر ہو۔ القائم بالقسط انصاف سے کام لے۔ الدائنُ بدینِ الحق۔ خود دینِ حق کا پابند ہو یا دوسروں سے دینِ حق کی پابندی کرائے۔ دونوں معنی صحیح ہیں۔ الحابسُ نفسہ علیٰ ذاتِ اللّٰہ۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ یعنی امت کی امامت اور پیشوائی کے لائق وہی ہے جس کا مقصد رضائے خدا کے سوا کچھ نہ ہو۔ علیٰ ذاتِ اللّٰہِ کے بھی ایسے ہی وسیع معنیٰ ہیں جیسے فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ کے۔ ہر وہ کام جو امت کے فائدے اور بھلائی کے لیے ہو،

راہِ خدا میں سمجھا جائے گا۔ راہِ خدا صرف نماز پڑھنے، روزہ رکھنے یا بیت اللہ کا حج کرنے تک ہی محدود نہیں ہے۔ امتِ مسلمہ کی بھلائی اور ترقی کے لیے جو قدم بھی اٹھایا جائے اور جو اقدام بھی مسلمانانِ عالم کو اسلامی مقاصد کے نزدیک تر کر دے اور ان کو ایسی طاقت بننے میں مدد دے جو پیروانِ قرآن کی شان کے شایان ہو وہی راہِ خدا ہے اور اسی راستے پر چلنا اپنے آپ کو ذاتِ خدا کے لیے وقف کرنا ہے۔

الحابس نفسه علی ذات اللّٰه والسلام۔

محمد بن جریر طبری نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ الامم والملوک" میں امام حسینؑ کی ایک اور مختصر تقریر نقل کی ہے جو آپ نے منزلِ ذی حسم میں کی تھی۔ اس تمام کے تلفظ میں کچھ اختلاف ہے۔ جو تلفظ میں نے کیا ہے شاید وہی زیادہ صحیح ہے۔ یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں پہنچ کر دشمن کے ہراول دستے نے یہ خطرہ پیدا کر دیا تھا کہ امام حسینؑ عراقی لشکر سے محصور ہو جائیں۔ یہاں امامؑ نے ایک خطبہ دیا تھا جس میں اپنے قیام کا راز بیان کیا۔

اَلاترون انّ الحقّ لایُعمَل به وانّ الباطلَ لایُتناھیٰ عنه۔ "کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں کیا جا رہا اور باطل سے بچا نہیں جا رہا" اور جب امت کی حالت ایسی ہو جائے تو سید الشہداءؑ جیسی ذمہ دار شخصیت پر قیام واجب ہو جاتا ہے۔ کیا تم خود نہیں دیکھ رہے ہو؟ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو کہ آپ بیعت کیوں نہیں کر لیتے اور اس اسلامی حکومت کو قبول کر کے فرزندِ معاویہ بن ابی سفیان کو ملتِ اسلامی کا رہبر و قائد کیوں تسلیم نہیں کر لیتے۔ حاصل یہ کہ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ملتِ اسلامی کی موجودہ صورتِ حال کو تم خود کیوں نہیں دیکھتے؟ الاترون انّ الحقّ لایُعمَل به۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں کیا جا رہا؟ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ جھوٹ

بولنے لگے ہیں یا اپنے گھروں میں بہت غیبت کرتے ہیں۔ اس طرح کی معصیتیں تو لوگوں میں ہمیشہ ہی رہی ہیں۔ مگر کیا تم نہیں دیکھتے کہ اسلامی قیادت حق وانصاف کی راہ سے کس قدر دور ہٹ گئی ہے اور اس کا کام ظلم اور ظالموں کی تائید بن گیا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل سے اجتناب نہیں کیا جارہا ؟ لیرغبِ المؤمنُ فی لقاءِ اللہ[1] - یہ جملہ خبریہ بھی ہو سکتا ہے اور انشائیہ بھی یعنی اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مومن خدا سے ملنے کا آرزومند ہوتا ہے یا جیسا کہ مناسب معلوم ہوتا ہے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ایسی افسوسناک صورتِ حال میں مومن کو چاہیے کہ وہ شوقِ شہادت میں اٹھ کھڑا ہو اور جان کی قربانی دینے اور خدا سے ملنے کے لیے تیار ہو جائے۔ فَاِنِّی لااری الموْت اِلّاشهادة۔ یہ وہی بات ہے جو آپ نے مسجد الحرام میں بھی کہی تھی جیسا کہ سید ابن طاؤس نے لہوف میں اور علی بن عیسیٰ نے کشف الغمہ میں نقل کیا ہے۔ وہاں بھی آپ نے شہادت، قربانی اور جاں نثاری کی بات کی تھی۔ یہاں بھی آپ نے فرمایا کہ میں اس راہ میں جان دینے کو شہادت سمجھتا ہوں ولا الحیاة مع الظالمین اِلّا برما۔ اور موجودہ حالات میں مومن کے لیے زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔

سامعین! میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے مختصر طور پر کہوں اور کسی حد تک اس وعدے کا پاس کروں جو اس مجلس کے منتظمین نے آپ سے کیا ہے کہ دس بجے مجلس ختم ہو جائے گی۔ اگرچہ میں یہ بھی عرض کر سکتا ہوں اقرارُ العُقلاءِ علیٰ انفسھم جائز[1]۔ عقلمند اپنے قول کے خود ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ میں نے تو کوئی وعدہ کیا نہیں تھا اس لیے میں کیوں کسی وعدے کی پابندی کروں۔ بہرحال ان کی عزت کا بھی خیال رکھنا ہے۔ صاحبِ اُسد الغابہ

ابن اثیر جزری کی ایک کتاب الکامل فی التاریخ ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اسلامی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ابن اثیر الکامل میں کہتا ہے : حر بن یزید ریاحی سے سامنا ہونے کے بعد امام حسینؑ نے دو خطبے دیے۔ ایک خطبہ ظہر کی نماز سے پہلے اور دوسرا عصر کی نماز کے بعد۔ عصر کے بعد امام حسینؑ نے اٹھ کر ایک تقریر کی اور حر بن یزید ریاحی اور ان کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا: اما بعد! یا ایھا الناس فانکم ان تتقوا اللہ وتعرفوا الحق لاھلہ یکن ارضی للہ۔ لوگو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے اور اہلِ حق کا حق تسلیم کرو گے تو یہ زیادہ اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔ یہاں بھی حق سے آپ کی مراد اس قسم کا حق نہیں کہ کسی نے ہمسائے کی دیوار کاٹ دی یا کوئی قطار میں اپنی باری کا انتظار کرنے کے بجائے کسی دوسرے مسافر کی باری پر بس میں سوار ہو گیا۔ یہاں مراد وہ حق ہے جس پر تمام حقوق کی بنیاد ہے، جس حق کو نقصان پہنچنے سے تمام حقوق کو نقصان پہنچتا ہے اور جس کے محفوظ رہنے سے دوسرے تمام حقوق کے محفوظ رہنے کا راستا کھلا رہتا ہے۔ یہ حق ہے ملت اسلامی کی سربراہی اور پیشوائی کا۔ فانکم ان تتقوا اللہ وتعرفوا الحق لاھلہ یکن ارضی للہ۔ اس کے بعد اور بھی وضاحت سے کہا: ونحنُ اھل البیت اولی بولایۃ ھٰذا الامر۔ ہم اہل بیتِ رسولؐ اور وارثانِ خاتم الانبیاءؐ سب سے زیادہ اس کے مستحق ہیں کہ تمہارے حاکم اور تمہارے دین اور دنیا کے قائد اور سربراہ ہوں۔ من ھٰؤلاءِ المدّعین ما لیس لھم۔ ہم ان لوگوں سے زیادہ حقدار ہیں، جو اس منصب کا غلط دعویٰ کرتے ہیں جس کا ان سے کوئی تعلق نہیں والسائرین فیکم بالجور والعُدوان جو لوگ تم پر ظلم اور زبردستی کر رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ

یہ لوگ جانشینانِ پیغمبرؐ اور قرآن کو رواج دینے والے تسلیم نہیں کیے جا سکتے۔ والسائرین فیکم بالجور والعدوان۔ ابن جریر طبری نے بھی امام حسینؑ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے جو آپ نے منزلِ بیضہ میں دیا تھا۔ بیضہ حجاز اور عراق کے درمیان ایک منزل ہے اور شاید عراق کی سرزمین کا ایک حصہ ہے۔ وہاں ابن جریر طبری کے مطابق امام حسینؑ نے اپنے اصحاب اور حر بن یزید ریاحی کے ہمراہیوں کے سامنے یہ خطبہ دیا تھا جس کو بعد میں اوروں نے بھی نقل کیا ہے۔ یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ اس موقع پر سید الشہداءؑ نے اپنے مقصد کا مزید انکشاف کیا اور بتلایا کہ آپ کی رائے میں صورتِ حال کیا تھی اور آپ نے کیوں قیام کیا۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: میرے نانا اور آپ کے پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی کسی ظالم سلطان، امام یا رہنما کو دیکھے کہ وہ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھتا ہو، خدا سے کیے ہوئے عہد کو توڑتا ہو اور رسولِ اکرمؐ کی سنت کی مخالفت کرتا ہو، اشارہ یزید کی طرف تھا جس کا یہی حال تھا۔ یزید ان ظالم اماموں میں سے تھا جن کے بارے میں آپ قرآن میں پڑھتے ہیں۔ وَمِنْهُمْ اَئِمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ۔ سب پیشوا اپنی قوم کو بہشت کی طرف نہیں لے جاتے۔ کچھ رہنما تو ایسے ہیں جو اپنی جماعت کو بہشت کی طرف لے جاتے ہیں یعنی دنیا و آخرت میں ان کی ترقی اور خوشحالی کی طرف، لیکن قرآن کے فرمان کے بموجب کچھ رہنما ایسے بھی ہیں جو اپنی قوم کو عذاب، آگ اور تباہی کی طرف دھکیلتے ہیں۔ ان کی ایک نمایاں مثال یزید بن معاویہ ہے۔ یہاں اشارہ اسی کی طرف ہے، جو لوگوں پر ظلم کرتا ہو، جرم و گناہ جس کا شعار ہو اور لوگوں کے حقوق پامال کرتا ہو، فلم یغیّر علیہ بفعلٍ ولا قولٍ۔ پس جو مسلمان ایسی صورتِ حال دیکھے جیسی آج میں (حسینؑ بن علیؑ) یزید کی حکومت میں دیکھ رہا ہوں

اور پھر بھی وہ مسلمان اس صورتِ حال کو اپنے قول وفعل سے بدلنے کی کوشش نہ کرے اس ظالم سلطان کے مقابلے میں اٹھ نہ کھڑا ہو، کوئی عملی اقدام نہ کرے یا کم از کم زبان ہی سے اس کی مخالفت نہ کرے تو پھر خدا کو اختیار ہے کہ اس مسلمان کو بھی وہیں لے جائے جہاں اس ظالم حکمران کو لے جائے گا اور دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ اس وقت ۶۰ ہجری میں ملتِ اسلامی کو بھی اسی صورتِ حال کا سامنا ہے۔ اَلَا وان ھٰؤُلَاءِ قد لزموا طاعة الشیطان۔ دیکھو ان لوگوں نے یعنی یزید اور اس کے گماشتوں نے مستقل طور پر شیطان کی فرمانبرداری اختیار کر لی ہے۔ وَترکُوا طاعة الرّحمٰن اور ان لوگوں نے پروردگارِ عالم کی فرمانبرداری چھوڑ دی ہے وَاَظهرُوا الفسَاد اور کھلم کھلا بدعنوانیاں کر رہے ہیں وعطّلوا الحُدود۔ انہوں نے حدود کو معطل کر دیا ہے۔ اگر کوئی تاجر یا عام آدمی کوئی جرم کرے تو اس کو اسلامی حدود کے مطابق سزا دیتے ہیں لیکن جو لوگ ان کے منظورِ نظر اور ان کے مفاد میں کام کرتے ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایک چھوڑ سو جرم بھی کرے تو اس کو ایک کوڑا بھی نہیں لگاتے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا اس اصول کی ابتداء خلافت عثمانی کے نصف دوم ہی میں ہو گئی تھی اور اسی وقت سے حکومت کے خلاف احتجاج اور قیام بھی شروع ہو گیا تھا۔ میں ان احتجاجوں کی ایک فہرست پیش کروں گا۔ وعطّلُوا الحُدود حدود معطل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ کسی پر حد جاری نہیں کرتے تھے۔ خود یزید کے زمانے میں بھی لوگوں کے ہاتھ کاٹے جاتے تھے۔ زناکاروں پر بھی حد جاری ہوتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ ڈاکوؤں کی گردن ماری جاتی تھی یا اور مختلف ایذائیں

دے کر انہیں سزا دی جاتی تھی۔ بہر حال یہ طے ہے کہ اس وقت کا پورا نظام شخصی مصلحتوں اور حکمرانوں کے اپنے مفاد کی بنیاد پر چلتا تھا۔ نفیاً بھی اور اثباتاً بھی۔ یعنی جس کو چاہتے تھے چھوڑ دیتے تھے اور جس کو چاہتے تھے سزا دیدیتے تھے۔ سید الشہداءؑ کہتے ہیں کہ یہی سب کجرویاں اور بدعنوانیاں میرے قیام کا سبب بنی ہیں۔ یزیدی حکومت کی ایک بڑی بدعنوانی یہ ہے کہ وَاستاثرُوا بالفئ عوام کا مال جو انکے فائدے کے لیے اور انکی مشکلات دور کرنے کے لیے خرچ کیا جانا چاہیے تھا وہ ارباب اقتدار نے اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ واستاثروا بالفئ واحلّوا حرام اللّٰہ۔ اور جن باتوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے وہ ان لوگوں نے حلال کر دیں۔ وحرّموا حلالہٗ اور جن چیزوں کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے وہ ان لوگوں نے حرام کر دیں۔ وانا احقّ مِن غیر۔ اس کے بعد امامؑ نے فرمایا کہ جب یہ صورتِ حال ہے اور رسولِؐ خدا کا حکم اس صورت میں یہ ہے تو مجھ سے بڑھ کر کون شخص اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ میں جنابِ فاطمہؑ کا بیٹا ہوں، اہل کساء میں سے ہوں۔ میں ان میں سے ہوں جن کی شان میں آیۂ تطہیر اور آیۂ مباہلہ نازل ہوئیں۔ میں امیر المومنین علیؑ کا فرزند ہوں تو پھر مجھ سے موزوں اور کون ہے جو اس صورتِ حال کو بدلے جس میں امت کے زوال کے سب عوامل اور اسباب جمع ہو گئے ہیں۔ حسینؑ سے بہتر کون ہے جو آئے اور قیام کرے۔ ابن عباس کی وہ بات نہیں۔ محمد بن حنفیہ کی بھی وہ بات نہیں۔ حبیب ابن مظاہر صحابی ہیں لیکن وہ بھی وہ کام نہیں کر سکتے جو حسینؑ کر سکتے ہیں۔ یہی صورت مسلم بن عوسجہ اور ہانی بن عروہ مرادی کی بھی ہے۔ حسینؑ کے چچا زاد بھائی

مسلم بن عقیل انکے اپنے بھائی ابوالفضل العباس ایسے لوگ ہیں جو اس قیام کے مقصد کے لیے جان لڑا سکتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اس مقدس تحریک کا مرکزی نقطہ نہیں بن سکتے ۔ اس تحریک کا مرکزی نقطہ تو حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب ہی کی شخصیت ہے ۔ عاشورا کے دن، اس کے باوجود کہ امام حسینؑ دیکھ رہے تھے کہ مخالفین ان کے قتل پر کمر بستہ ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والے ہیں آپ کو اطمینان تھا کہ جیسا کہ آپ چاہتے تھے ویسا ہی ہو رہا ہے ۔ پھر بھی آپ نے ایک خطبہ میں اسی مضمون سے گفتگو کا آغاز کیا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ امام حسینؑ نے عاشورا کے دن کئی خطبے دیے اور کئی تقریریں کیں ۔ یہ سب خطبے انتہائی فصیح و بلیغ اور موثر ہیں ۔ حیرت تو یہ ہے کہ یہ خطبے ایک ایسے خطیب کے ہیں جو خوب جانتا تھا کہ ان تقریروں کے بعد نہ صرف اس سے بازپرس کی جائے گی بلکہ یہ بازپرس تیس ہزار نیزوں کی مدد سے کی جائے گی ۔ یہ خطبے ایک ایسے خطیب کے ہیں جو پیاسا تھا اور اپنے ہونٹوں کو تر کرنے کے لیے جس کو پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں تھا ۔ اسے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد اس کے زن و فرزند گستاخ اور سنگدل دشمنوں کے ہاتھوں میں قید ہونے والے ہیں ۔ جس کو قطعاً کھانے کے لیے کافی غذا نہیں مل سکتی تھی لیکن اس نے پیاس کی تو پھر بھی شکایت کی لیکن ازراہِ خودداری بھوک کی قطعاً شکایت نہیں کی ۔ گو یہ حقیقت ہے کہ سید الشہداؑ بھوکے بھی تھے امام سجادؑ کہتے ہیں کہ رسولؐ خدا کے نواسے کو اس حال میں قتل کیا گیا کہ آپ تشنہ لب اور بھوکے پیٹ تھے ۔ ایک بھوکا پیاسا خطیب دشمن کے ان تیس ہزار سپاہیوں کے سامنے تقریر کرتا ہے جن کے نیزے اس کو قتل کرنے کے لیے تیار ہیں اور جن کے گھوڑے کچھ دیر بعد اس کے بدن کو پامال کریں گے ۔

اس کے باوجود وہ تقریر کرتا ہے اور ٹھوس تقریر کرتا ہے۔ اس کی تقریر میں فصاحت اور پختگی ہے۔ وہ اپنی کمزوری اور بے بسی کا اظہار نہیں کرتا۔ جیسے جیسے اس کے ساتھیوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے، اس کی تقریر کا زور بڑھتا جاتا ہے۔ وہ اپنی بات زیادہ صفائی اور وضاحت سے کہنے لگتا ہے۔ کیا پوری انسانی تاریخ میں کسی نے ایسا خطیب دیکھا ہے جس کی تقریر کا اسلوب کسی صورت حال سے بھی متاثر نہ ہو۔ جو کسی حال میں پریشان نہ ہو اور جس کی تقریر کی روانی میں کسی طور فرق نہ آئے۔ ایک تقریر میں آپ نے کہا: تبًّا لکمُ ایتها الجماعة و ترحًا۔ بدبختو! تم پر خدا کی مار۔ تم مجھے یہاں قتل کرنے اور اپنی رسوائی کا سامان جمع کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہو؟ حین استصرختمونا والهین فاصرخنا کم موجفین - کیا تم وہی نہیں ہو جنہوں نے ایک ماہ پیشتر بڑے شوق و ذوق سے ہم سے فریاد کی تھی کہ ہم یزید بن معاویہ کو بحیثیت سربراہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں؟ ہم نے خلوص سے تمہاری فریاد کا ہمدردانہ جواب دیا اور ہم آ گئے۔ اب تم یہ کیا کر رہے ہو؟ سللتم علینا سیفا لنا فی ایمانکمُ و حششتم علینا نارًا اقتدحناها علیٰ عدوّنا و عدوّکم۔ اس نکتہ کی طرف ذرا توجہ کیجیے۔ عجیب جملہ ہے۔ فرمایا: معلوم ہے تم حسینؑ بن علیؑ اور اسلام کے بہترین اور مخلص ترین جانباز سپاہیوں کے خلاف کونسی تلواریں سونت رہے ہو؟ یہ وہی تلواریں ہیں جو پیغمبر اسلامؐ نے تمہارے ہاتھوں میں دی تھیں۔ جو آگ کہ ہم نے اپنے اور تمہارے دشمن کو بھسم کر دینے کے لیے جلائی تھی وہی آگ اب تم ہمارے جلانے اور تباہ کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہو۔ فاصبحتمُ البًا لاعدائکم علیٰ اولیائکم۔ امام حسینؑ

کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ یزید بن معاویہ جو آج تم مسلمانوں کا خلیفہ بن گیا ہے، یہ تمہارا دوست نہیں دشمن ہے۔ تمہارے اندر دوست اور دشمن میں تمیز کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی اس لیے تم یہ فرق نہیں کر سکتے کہ کس کا ساتھ دینا تمہارے لیے سود مند ہے اور کس کا ساتھ دینا نقصان دہ۔ تم سب اپنے دشمنوں کے مفاد میں اپنے دوستوں کے خلاف متحد ہو گئے ہو۔ بغیر عدل افشوہ فیکم و لا امل اصبح لکم فیھم حالانکہ انہوں نے کبھی تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا اور نہ آئندہ تمہیں ان سے کوئی امید ہے۔ عاشورے کے دن ایک اور خطبے میں فرمایا: الا وانّ الدعیّ ابن الدعیّ قد رکزنی بین اثنتین۔ یہ نہ بھولیے گا کہ عاشورا کے دن جب امام حسینؑ تقریر کر رہے تھے، وہ بری طرح خونخوار دشمنوں کے نرغے میں تھے۔ ان کے اصحاب کی محدود تعداد کے علاوہ کوئی بھی ان کا دوست اور خیر خواہ وہاں موجود نہیں تھا بلکہ اصحاب میں سے بھی اکثر صبح کے سخت حملے اور تیروں کی بوچھاڑ کے نتیجے میں شہید ہو چکے تھے جو باقی تھے وہ بھی زخموں سے چُور تھے۔ ان حالات میں اس عظیم شخصیت نے اپنے دشمنوں کو مخاطب کر کے کہا: الا وانّ الدعیّ بن الدعیّ قد رکزنی بین اثنتین۔

خدا کی قسم اگر حسینؑ ابن علیؑ میں اور کوئی بھی ایسی خوبی نہ ہوتی جس کی وجہ سے آزاد انسان ان پر فریفتہ ہوں تو اپنی تحریک اور اپنے قیام کے جواز میں ان کا طرزِ استدلال ہی اس کے لیے کافی تھا کہ آپ کو ان تمام لوگوں کا سردار تسلیم کر لیا جائے جو قیامت تک حق و انصاف کی طرفداری اور ظلم کی سرکوبی کے لیے اٹھتے رہیں گے۔ آپ نے فرمایا: الا انّ الدعیّ بن الدعیّ قد رکزنی بین اثنتین بین السلّۃ والذلّۃ۔ اے اہل کوفہ! دیکھو

میں نے اجتماعی صورتِ حال کا بغور جائزہ لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اصل بات کیا ہے۔ اس حرامی ابن حرامی یعنی عبید اللہ ابن زیاد بن ابیہ نے مجھے اس طرح باندھ کر رکھ دیا ہے کہ میرے لیے ان دو میں سے کوئی ایک راستا اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ میں ان دو میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کروں یا تو تلواریں نیام سے نکال لی جائیں اور جنگ شروع ہو جائے یا پھر ذلت و خواری قبول کر لوں۔ بندہ عرض کرتا ہے کہ یہاں ذلت و خواری قبول کرنے سے محض یہ مراد نہیں کہ میں خود اپنے لیے ذلت قبول کر لوں بلکہ یہ بھی ہے کہ میں امت کے لیے ذلت، بے بسی اور زبوں حالی کا راستا کھول دوں، وہ امت کہ جسے خدا و رسولؐ نے عزت بخشی اور سربلند کیا۔

ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس باعزت اور بلند مرتبہ امت کو حسینؑ بن علیؑ اپنی امامت کے زمانے میں ذلیل ہونے کی اجازت دیں۔ وھیھات منّا الذلّة لیکن یہ سمجھ لو کہ میرا فیصلہ قطعی اور اٹل ہے۔ میں نے جنگ کے راستے کا انتخاب کر لیا ہے کیونکہ ہم ذلیل ہونے والے نہیں۔ بہ الفاظ دیگر ملت اسلامی سے ذلت کوسوں دور ہے۔ اس امت کو خدا نے معزز پیدا کیا ہے۔ وھیھات منّا الذلّة یأبَی اللہ ذٰلك لنا ورسُولهٗ والمُؤمِنُون ۔ یہ بات کہ ہم ذلیل ہوں نہ اللہ کو پسند ہے، نہ اس کے رسولؐ کو اور نہ مومنین کو وحُجُورٌ طابت وطهرت۔ ہم نے ماؤں کی جن پاکیزہ گودوں میں پرورش پائی ہے ان کو یہ منظور نہیں کہ ہم اپنے یا امت کے لیے ذلت و خواری اور مایوسی اور ناامیدی کا دروازہ کھولیں۔ واُنوفٌ حميّة ونفوسٌ ابيّه من ان توثر طاعة اللئام علیٰ مصارع الکرام ۔ یہاں طاعتِ لئام کا نکتہ بھی عجیب ہے۔ فرمایا کہ یہ بہادر جو میرے ساتھ ہیں، یہ جواں مرد جو

میرے ساتھ آئے ہیں اور میرے ارد گرد صف آراء ہیں ان کو بھی اپنی اور امت کی خواری منظور نہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں جو ادنیٰ درجے کے کمینے لوگوں کی اطاعت اور فرمانبرداری کو شہادت اور جاں نثاری پر ترجیح دیں۔ علی بن الحسینؑ یعنی علی اکبرؑ نے جب عاشورے کے دن رجز پڑھا تو اپنے والد کی اس بات کو اپنے رجز کا عنوان قرار دیا:

انا علیّ بن الحسین بن علیّ — نحن و بیت اللہ اولیٰ بالنبیّ
اطعنکم بالرمح حتّٰی ینثنی — اضربکم بالسیف احمی عن ابی
ضرب غلام ھاشمیّ عربیّ — واللہ لا یحکم فینا ابن الدعی

"میں حسینؑ بن علیؑ کا بیٹا ہوں۔ ہم اور بیت اللہ نبیؐ سے قریب تر ہیں۔ میں تمہارے نیزہ گھونپتا رہوں گا، یہاں تک کہ میرا نیزہ مڑ جائے۔ میں تمہیں تلوار کی ایسی ضرب لگاؤں گا جو میرے والد گرامی کی ضرب سے بھی شدید ہوگی، یہ ضرب ایک ہاشمی و عربی نوجوان کی ضرب ہوگی۔ بخدا حرامی کا بیٹا ہم پر حکومت نہیں کر سکتا۔"

سید الشہداءؑ کے کچھ فرمان، اقوال اور تحریریں میں نے اس رات نقل کی تھیں اور کچھ آج نقل کی ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں یہ بھی عرض کردوں کہ عاشورے کے دن اپنے ایک خطبے میں امام حسینؑ نے کچھ شعر بھی پڑھے تھے۔ امام حسینؑ کی تحریک کے اسباب کم و بیش واضح ہو چکے۔ آپ کو اپنی تحریک کے ہر مرحلے میں اپنی کامیابی کا مکمل یقین تھا۔ آپ مطمئن تھے کہ آپ کی جد و جہد نتیجہ خیز ہوگی۔ آپ کی کوشش اور آپ کے ہمراہیوں کی جانبازی رائیگاں نہیں جائے گی۔ اپنے ایک خطبے میں سید الشہداءؑ نے فروہ ابن مُسیک مرادی کے اشعار پڑھے تھے۔ فروہ ابن مُسیک ایک بزرگ صحابی تھے،

ان کے یہ اشعار عجیب روح پرور اور پُرمعنی ہیں۔ امام حسینؑ نے دشمن کے سامنے یہ اشعار پڑھ کر یہ قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ کامیابی آپ ہی کا حصہ ہے اور آپ کی جدوجہد نتیجہ خیز رہے گی۔

فَاِنْ نَهْزِمْ فَهَزَّامُوْنَ قِدْمًا
وَاِنْ نُهْزَمْ فَغَيْرُ مُغَلَّبِيْنَا

اگر ہم شکست دیں تو یہ ہماری پرانی عادت ہے۔ ہم ہمیشہ سے اپنے دشمنوں کا سر کچلتے آئے ہیں لیکن اگر ہم شکست کھا جائیں، قتل ہو جائیں اور بظاہر فتح تمہاری ہو جائے، جب بھی ہماری شکست نہیں ہوگی اور ہم مغلوب نہیں ہوں گے۔ ہم ماریں یا مارے جائیں، ہر حال میں جیت ہماری ہی ہے۔

وَمَا اِنْ طِبُّنَا جُبْنٌ وَلٰكِنْ
مَنَايَانَا وَدَوْلَةُ اٰخِرِيْنَا

ہم ڈرپوک اور بزدل نہیں ہیں۔ ہم دنیا کے بہادر سردار ہیں۔ اگر ہم مارے گئے تو اس لیے نہیں مارے جائیں گے کہ ہم ڈرپوک تھے، بلکہ اس لیے مارے جائیں گے کہ ہماری قضا آگئی تھی اور روزِ شہادت آپہنچا تھا۔

اِذَا مَا الْمَوْتُ رُفِعَ عَنْ اُنَاسٍ
كَلَاكِلَهٗ اَنَاخَ بِاٰخَرِيْنَا

زمانے کا دستور یہی ہے، موت کبھی ایک پر حملہ کرتی ہے کبھی دوسرے پر۔ مطلب یہ کہ آج ہم موت کی لپیٹ میں ہیں کل ہمارے دشمن ہوں گے۔

فَاَفْنٰى ذٰلِكُمْ سَرَوَاتِ قَوْمِيْ
كَمَا اَفْنَى الْقُرُوْنَ الْاَوَّلِيْنَا

موت نے جس طرح اگلی نسلوں کو فنا کر دیا، اسی طرح ہمارے بزرگوں

کو بھی فنا کر دیا۔ اس کے بعد ایک عجیب غیر معمولی شعر ہے ؎

فَلَوْ خَلَدَ الْمُلُوْکُ اذًا خَلَدْنَا
وَلَوْ بَقِیَ الْکِرَامُ اذًا بَقِیْنَا

اگر شاہانِ عالم ہمیشہ زندہ رہا کرتے تو ہم بھی ہمیشہ زندہ رہتے، کیونکہ ہم ملک و ملکوت کے بادشاہ ہیں اور اگر شرفاء اور معزز ترین اشخاص کو حیاتِ جاودانی ملا کرتی تو سب سے پہلے ہمیں ملتی۔

غرض امام حسینؑ ہر مرحلے میں نتیجے کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھے۔ میں اپنی معروضات کے آخر میں ایک اور نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے یا کسی اور جگہ پر جو کچھ بیان ہوا ہے، شاید اس سے بعض لوگ یہ نتیجہ اخذ کریں کہ سید الشہداءؑ کا قیام اور ان کی تحریک ہی اسلام میں واحد مقدس اور مسلح مہم ہے اور تا روزِ قیامت اب اس طرح کی کسی اور جد و جہد کی گنجائش نہیں۔ بات یوں نہیں ہے۔ امام حسینؑ کی تحریک سے پہلے بھی اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں اور بعد میں بھی اور آئندہ بھی ملتی رہیں گی جیسا کہ میں نے عرض کیا سید الشہداءؑ کی ذاتِ مقدس اسلامی تحریکوں کا مرکزی نقطہ ہے۔ امام حسینؑ کے قیام نے اپنے سے پیشتر کی تحریکوں کی تائید کی اور آئندہ کے لیے ایک مثال قائم کر دی۔ اگر امام حسینؑ کے قیام کی کوئی یہ تشریح کرے کہ آپ کے قیام نے ملتِ اسلامیہ کو ہمیشہ کے لیے ہر تحریک اور جد و جہد سے بری الذمہ کر دیا ہے اور اب صرف آپ کی نویں پشت میں امام مہدیؑ ہی کسی دن آ کر ایسی تحریک چلائیں گے۔ باقی دنیا کے مسلمانوں کو بے فکری ہو گئی اور اب ان کا کوئی فرض نہیں رہا تو یہ محض خیالِ خام ہے۔ اس طرح کی سوچ درحقیقت امام حسینؑ کے مقصد اور ان کے ہدف کے بالکل

برعکس ہے۔ میں نے آٹھویں کی شب میں کہا تھا کہ عثمانی دورِ خلافت کے نصف دوم میں مسلمان اسلامی حکومت کے صحیح راستے سے بہت دور ہٹ گئے تھے۔ وہیں سے قیام کی ابتدا بھی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی گفتگو کا عنوان رکھا تھا وہ اسباب جنہوں نے امام حسینؑ کو قیام پر مجبور کیا یا امام حسینؑ کے قیام کے محرکات، اس لیے یہ نامناسب ہوگا اگر میں اس کی وضاحت نہ کروں کہ جس مقصد سے امام حسینؑ نے قیام کیا اور تحریک چلائی اسی مقصد سے ان سے پیشتر اسلامی تاریخ میں کچھ اور بزرگ ہستیاں بھی جدوجہد کرتی رہی تھیں اور امام حسینؑ کے بعد بھی یہ جدوجہد جاری رہی۔ اگر لوگ جدوجہد کے ان واقعات کی قدر و قیمت نہیں سمجھتے یا نہیں سمجھ سکتے تو اس کی وجہ انکی ناواقفیت یا نادانی ہے۔ عُذرُھُم جَہلُھُم۔ ابوذر غفاریؓ غیر معمولی شخصیت کے آدمی تھے۔ انہوں نے جونہی محسوس کیا کہ حکومت کا نظام اپنی ڈگر سے ہٹ گیا ہے، وہ بڑھاپے کے باوجود اس کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے۔ سخت مخالفت کی۔ تند و تیز نکتہ چینی کی، تقریریں کیں۔ خاتم الانبیاءؐ کی حدیثیں سنائیں۔ عثمان کی موجودگی میں اور ان کی پیٹھ پیچھے کوچہ و بازار میں اعتراضات کیے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخی لحاظ سے اس تمام جدوجہد اور تحریکوں کے بانی صحابئ رسولؐ ابوذرؓ ہی تھے۔ چنانچہ شہر بدر کیے گئے تکلیفیں اٹھائیں۔ آخر وطن سے دور بے کسی کے عالم میں ربذہ کے مقام پر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ابوذرؓ اور عثمان کے بعد امیر المومنینؑ شہید ہو گئے اور معاویہ بروئے کار آئے تو لوگوں نے پھر وہ سلسلہ شروع کر دیا۔ ابوذر غفاریؓ نہ رہے تو ان کی جگہ حجر بن عدی کندیؓ نے لے لی۔ ابوذرؓ تو اکیلے تھے۔ حجرؓ کے ساتھ تیرہ اور دوسرے ممتاز مسلمانوں نے معاویہ بن ابی سفیان کی کجروی کے خلاف

آواز بلند کی، ان چودہ اشخاص کو زنجیروں میں باندھ کر عراق سے شام بیجایا گیا۔ وہاں دو آدمی تو چھوڑ دیے گئے۔ باقی بارہ آدمیوں کو مَرج العذرا نامی مقام پر بیجایا گیا۔ وہاں چھ آدمیوں کی گردن ماردی گئی۔ چار آدمیوں کو کسی نہ کسی کی سفارش پر رہائی ملی۔ دو نے کہا کہ ہمیں معاویہ کے پاس لے چلو تاکہ ہم وہاں جاکر باقاعدہ توبہ کرلیں۔ ان دونوں کو معاویہ کے پاس لے گئے۔ وہاں ایک تو معافی مانگ کر چھوٹ گیا مگر دوسرے نے معاویہ کے سامنے معاویہ پر اور بھی سخت نکتہ چینی کی اور اعتراض کرنے شروع کر دیے۔ معاویہ نے کہا یہ تو سب سے خراب شخص ہے اسے یہاں کیوں لے آئے ہو؟ ساتھ ہی عراق کے گورنر زیاد بن ابیہ کو خط لکھا۔ ان صاحب کا نام عبدالرحمٰن بن حسّان عنزی شہید تھا۔ معاویہ نے ان کو عراق بھجوا دیا اور ابن زیاد کو لکھا اُقتُلۡهُ شَرَّ قِتلَةٍ اس شخص کو بدترین طریقے سے قتل کردو۔ جب معاویہ کا فرمان ابن زیاد کے پاس پہنچا، اس نے کہا کہ امیرالمومنین نے مجھے حکم دیا ہے کہ تجھے بدترین طریقے سے قتل کردوں۔ میرے خیال میں بدترین طریقہ قتل کا یہ ہے کہ تجھے قبر کھود کر اس میں زندہ دفن کردوں۔ ان بزرگ کا شمار شہدائے اسلام میں ہے۔ یہ امیرالمومنینؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کا گناہ فقط اتنا تھا کہ یہ اس وقت کی رسوائے زمانہ صورتِ حال پر نکتہ چینی کرتے تھے لہٰذا قبر کھود کر ان کو زندہ درگور کر دیا گیا اور اوپر سے مٹی پاٹ دی گئی۔ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے۔ کامل ابن اثیر اور دوسری مستند کتابوں میں یہ قصہ دیکھا جاسکتا ہے۔ جب سید الشہداءؑ کا زمانہ آیا، آپ نے بھی اسی پچھلے طریقہ پر عمل کرنا شروع کیا۔ آخر میں البتہ آپ کی جدوجہد نے وہ خاص اچھوتا رخ اختیار کیا جو آپ کے زمانے کے حالات کے اعتبار سے موزوں اور خود آپ کے شایان شان تھا۔ چنانچہ آپ خود اور آپ

کے اقربا شہید ہوئے اور کئی لحاظ سے آپ کے قیام نے اسلامی تاریخ کی تمام اگلی پچھلی مقدس تحریکوں میں مرکزی حیثیت حاصل کرلی۔ یہ بھی عرض کردوں کہ اس منبر سے اس قابل صد احترام مجلس میں جب میں قیام، جدوجہد اور تحریک کی بات کرتا ہوں تو اس سے مراد ہر طرح کی افراتفری اور بدنظمی پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ صرف وہ مقدس تحریکیں مراد ہیں جو اسلام کی تاریخ میں لائق اور محترم شخصیتوں نے صورتِ حال کے صحیح اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کے بعد مسلمانوں کی بہتری اور اصلاحِ احوال کے لیے چلائیں۔ امام حسینؑ نے قیام اور تحریک کا دفتر بند کرکے اس پر مہر نہیں لگادی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جس طرح امام حسینؑ نے یزید کے خلاف قیام کیا اسی طرح امام حسینؑ کے پوتے زید بن علی نے ہشام بن عبدالملک کے خلاف قیام کیا۔ زید بن علی قتل ہوئے۔ ان کے جسم کو سولی پر لٹکایا گیا۔ اگرچہ ان کے حامیوں نے راتوں رات ان کی لاش کو دفن کردیا تھا اور ان کی قبر کو زیرِ آب کردیا تھا، مگر جاسوسوں نے دشمن کو اطلاع دیدی۔ چنانچہ اگلے دن ان کی قبر کھود کر لاش نکال لی گئی اور اس کو برہنہ کرکے اس جگہ سولی پر لٹکادیا گیا جہاں کوفہ میں شہر کا کوڑا پھینکا جاتا تھا۔ چار سال تک زید بن علی کی لاش اسی طرح سولی پر لٹکتی رہی۔ وہ لوگ یہ سمجھتے رہے کہ زید بن علی کے جسم کے سولی پر لٹکتے رہنے میں ہشام بن عبدالملک کا فائدہ ہے اور آلِ محمدؐ کا نقصان، لیکن تاریخ نے قطعی فیصلہ کردیا کہ اس سارے قضیے میں صرف حق اور اہل حق کا ہی فائدہ تھا۔ زید بن علی کے بعد ان کے صاحبزادے یحییٰ بن زید نے قیام کیا۔ ان کی لاش سات سال تک سولی پر لٹکتی رہی۔ تاریخ اسلام کے وہ قیام جو عرصہ دراز تک اموی اور عباسی خلافتوں کے دوران میں ہوتے رہے اور جن کی ابتدا ابوذرؓ سے ہوئی، ان کے علم بردار ایک دن حجر بن عدی تھے۔ ایک دن حسینؑ بن علیؑ

جو تمام مقدس تحریکوں کا مرکز بن گئے۔ ایک دن زید بن علی، ایک دن یحییٰ بن زید، ایک دن حسین بن علی بن الحسن بن علی بن ابی طالب تھے جو شہدائے فخ کے رہنما تھے، اسی طرح ایک دن موسیٰ بن جعفرؑ اور ایک دن کچھ دوسرے۔ اگر کوئی ان تحریکوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کو سمجھنا اور جاننا نہیں چاہتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں کچھ شرعی قباحتیں بھی بیان کرتا ہے، تو ایسے شخص کے متعلق بڑے افسوس کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسخرہ ہے۔

زید بن علی کا فعل اور ان کا قیام شرعی تھا یا نہیں؟ یحییٰ بن زید نے جو قیام کیا تھا وہ شریعت کے مطابق تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ زید بن علی کے قیام کو امام صادقؑ نے درست قرار دیا تھا اور اس کی توثیق کی تھی۔ ان کی شہادت کے بعد امام صادقؑ نے فرمایا تھا کہ میرے چچا زید بن علی نے بھی وہی راستہ اختیار کیا جو شہدائے بدر نے زمانۂ رسالتمآب میں اختیار کیا تھا۔ ہدف سب کا ایک ہی تھا۔ جو مقصد شہدائے بدر کا تھا وہی زید بن علی کا تھا۔ اب نص کے مقابلے میں تو کوئی اجتہاد صحیح نہیں ہو سکتا اور نہ کسی امت کے لیے سرفروشی اور قیام کی سخت ضرورت کے بارے میں بے خبری درست ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ عُذرُھُم جَہلُھُم (بیچارے ناواقفیت کی وجہ سے معذور ہیں) بندہ نے اسلامی تاریخ کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، باقی اقوام کی تاریخ کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا اس لیے میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا، ہاں اجمالی طور پر اس میں شبہ نہیں کہ نہ صرف مسلمانانِ عالم بلکہ عیسائی یہودی اور جو بھی قوم دنیا میں زندہ موجود ہے وہ اپنی جدوجہد اور مقدس تحریکوں ہی کے طفیل زندہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے

کہ اسلامی تاریخ میں ایک خاص صورت پیش آئی ہے۔ بیجا نہ ہوگا اگر اس موقع پر ایک اور نکتہ بھی عرض کر دوں، گو میری آج کی تقریر سے اس کا براہِ راست تو تعلق نہیں ہے پھر بھی اس کو نظر انداز کرنا غلط ہوگا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے سانحہ نے اسلامی تاریخ کے تمام حادثات، تمام تحریکوں اور مسلح جد و جہد کے تمام واقعات میں مرکزیت حاصل کر لی ہے۔ کسی اور قیام، تحریک اور اجتماعی شہادت کے واقعہ نے وہ شہرت اور اہمیت حاصل نہیں کی جو واقعۂ کربلا نے کی۔ یہ سانحہ اسلامی تاریخ کے تمام المیوں سے بازی لے گیا۔ غزوۂ احد میں اسی (۸۰) افراد سے زیادہ، جہاں تک میں نے گنا ہے، شہید ہوئے۔ یہ بڑا دردناک سانحہ تھا۔ شہدائے احد کے جسموں کا مثلہ کیا گیا۔ شہیدوں کے ناک، کان اور ہونٹ کاٹ لیے گئے اور ان کے جسم اس طرح مسخ کر دیے گئے کہ بہنیں اپنے بھائیوں کی لاشیں دیکھ کر انہیں پہچان نہیں سکتی تھیں لیکن اس کے باوجود احد کے سانحہ کی وہ حیثیت نہیں جو کربلا کے حادثۂ فاجعہ کی ہے۔ ایک اور بڑا سانحہ یہ تھا کہ منصور دوانیقی کے حکم سے حَسنی سادات میں سے سولہ افراد کوفہ کے ہاشمی قید خانے میں بند کر دیے گئے۔ وہ وہیں یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے لیکن منصور نے اس کی اجازت نہیں دی کہ ان میں سے کسی کی لاش باہر لائی جائے۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے وہ سب مر گئے۔ ان میں سے جو مرتے جاتے تھے ان کی لاشیں زندہ بچنے والوں کی آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں۔ جب یہ سب دنیا سے کوچ کر گئے تو منصور نے حکم دیا کہ قید خانے کی چھت ان سولہ شہداء اور فرزندانِ رسولؐ خدا پر گرا دی جائے۔ ان کو نہ غسل دیا گیا اور نہ کفن۔ نہ کسی کو سپردِ خاک ہی کیا گیا۔ اس فاجعہ کی حیثیت بھی سانحۂ کربلا کی سی نہیں۔ لَا یَوْمَ کَیَوْمِكَ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ (اے ابوعبداللہ

آپ کے واقعہ کی تو کوئی نظیر ہی نہیں!) بالکل صحیح اور مستند بات ہے۔ قطعاً یہی صورت ہے لیکن یہ صورت کیوں ہے؟ اس کے جواب میں گو میری تقریر کا وقت ختم ہو گیا ہے، اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ سید الشہداءؑ کی تحریک اور ان کے قیام کی برتری کا ایک نہایت اہم سبب وہ واقعات ہیں جو امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب کی شہادت کے فوراً بعد پیش آئے۔ اس قیام کو ایک طرف تو اسیرانِ اہل بیتؑ کی بدولت شہرت ملی اور دوسری طرف خود قاتلانِ حسینؑ نے اس کو شہرت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ امام کی شہادت کے بعد اور معرکے کے ختم ہو جانے پر دشمنوں نے کمینگی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ شہداءؑ کے جسم کے ٹکڑے کر دیے۔ ان کے کپڑے لوٹ لیے۔ خیموں کو لوٹا اور ان کو آگ لگائی۔ شہیدوں کے بدن گھوڑوں کے سموں تلے روندے، ان کے سروں کو نیزوں پر چڑھایا۔ غم نصیب قیدیوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا۔ ان کے خشک ہونٹوں پر لکڑیاں ماریں۔ یہ بے ہودگیاں کربلا سے شروع ہوئیں اور شام تک جاری رہیں۔ یزید نے ذاتی طور پر ان بے ہودگیوں میں حصہ لیا لیکن اسیرانِ اہل بیتؑ جہاں بھی گئے انہوں نے ایسے وقار اور متانت کے ساتھ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، اپنی کامیابی اور دشمن کی رسوائی کا تذکرہ کیا۔ ایسے وقت میں جب کہ سب لوگ انہیں شکست خوردہ اور دشمن کو کامیاب تصور کر رہے تھے، انہوں نے یہ جتلا دیا کہ در اصل کامیاب و کامران تو وہ ہوئے ہیں اور مغرور دشمن کے حصے میں تو صرف رسوائی آئی ہے۔

امام زین العابدینؑ نے شہر کوفہ کے مضافات میں اور زینبؑ، ام کلثومؑ اور فاطمہ بنت الحسینؑ نے کوفہ کے بازاروں میں تقریریں کیں اور عام لوگوں کی توقع اور اندازے کے برعکس بنی امیہ کی حکومت کے زوال کا اعلان کیا۔

زینبِ کبریٰ نے ایک اور موقع پر یزید کے دربار میں تقریر کی اور واضح الفاظ میں تین بار اس کی تکفیر کی۔ امام زین العابدینؑ نے دمشق میں خطبہ دیا جس میں اچھی طرح اپنا تعارف کرایا اور یزید کے لیے مشکلات پیدا کر دیں۔ جب امام عابدؑ ایک قیدی کی حیثیت سے دمشق کے بازار میں تھے، ابراہیم بن طلحہ بن عبیداللہ نے ان کے پاس آ کر چڑانے کے لیے کہا: علیؑ بن الحسینؑ کہو جیت کس کی ہوئی؟ امام عابدؑ نے اس کے جواب میں کہا: جب نماز کا وقت ہو جائے تو اذان دینا اور اقامت کہنا، اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ جیت کس کی ہوئی۔ یعنی گو تیرا تعلق خاندانِ تیم سے ہے اور تو بنی ہاشم کا دشمن ہے پھر بھی جب تک تو اسلام کو چھوڑ ہی نہ دے اذان اور اقامت میں یہی کہے گا کہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ فرزندانِ محمدؐ ہم ہیں نہ کوئی اور۔ جب تک اسلام کا نام قائم ہے، ہم آلِ محمدؐ کی عزت بھی برقرار رہے گی۔ اس میں فرق نہیں آ سکتا۔

مجھے تو یقین ہے کہ اگر ابن سعد اور ابن زیاد، خواہ خود غرضی ہی سے سہی، امام حسینؑ اور آپ کی شہادت کے بعد اہل بیتؑ کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آتے، شہداء کی تدفین میں مانع نہ ہوتے، اہل بیتؑ کو کربلا ہی سے براہِ راست مدینہ بھجوا دیتے اور دربارِ خلافت کی بے ہودگیوں اور اہل بیتؑ کے اپنے حق میں موثر پروپیگنڈے کے واقعات پیش نہ آتے تو امام حسینؑ اور ان کے بزرگ رفقاء کی شہادت کی یہ تصویر جو دنیا میں ابھری وہ نہ ابھرتی، اور ان کے دشمن اس طرح ذلیل و رسوا نہ ہوتے۔

ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلیّ العظیم

جب تک اس خاک پہ باقی ہے وجود اشرار
دوش انسان پہ ہے جب تک حشم تخت کا بار
جب تک اقدار سے اغراض ہیں گرم پیکار
کربلا ہاتھ سے پھینکے گی نہ ہرگز تلوار

کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

جوشؔ

خطبہ اور منبر

①

أَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلرَّحْمٰنُ * عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ * خَلَقَ الْاِنْسَانَ * عَلَّمَہُ الْبَیَانَ *

آج کی گفتگو کا موضوع ہے 'خطبہ اور منبر' چونکہ خطبہ کے معنی بھی تقریر ہیں، اس لیے اس تقریر کا موضوع "تقریر" ہے یعنی یہ آپ اپنا موضوع ہے۔ تقریر کرنے کو علمی زبان میں خطابت کہتے ہیں۔ منطقیوں نے کلام کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں جن کو 'صناعاتِ خمسہ' یعنی پانچ ہنر کہا جاتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک خطابت ہے۔

یہ تقسیم ارسطو کی قائم کی ہوئی ہے۔ اس وقت موقع نہیں کہ خطابت کی تاریخ بیان کی جائے یا خطابت کی فنی اقسام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر گفتگو کی جائے۔ بعض منطقیوں نے خاص طور پر اس کی خوب تفصیل بیان کی ہے۔ اگر ہم صرف اس تفصیل کو پیشِ نظر رکھیں جو بوعلی سینا کی کتاب 'شفا' میں بیان کی گئی ہے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ مگر ان باتوں پر

بحث مقصود نہیں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ صرف نظری پہلو سے گفتگو نہ کی جائے۔ چونکہ ہماری گفتگو کا موضوع ہے "خطبہ اور منبر" اور منبر سے مراد ہے دینی موضوعات پر تقریر ــــ اس لیے ہماری آج کی گفتگو دینی خطابت کے بارے میں ہے خطابت اور کلام کی دوسری اقسام سے غرض نہیں۔ آج میں اسلام سے خطابت کے تعلق پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

خطابت کا اسلام سے تعلق

خطابت کا اسلام سے تعلق کئی پہلو سے ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خطابت ایک فن اور ایک ہنر ہے اور کسی بھی فن یا صنعت کو کسی نظریے یا عقیدے کی تقویت کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور اسے کمزور کرنے کے لیے بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ فن اور صنعت میں کیا فرق ہے۔

اگر آپ اصفہان میں مسجدِ شاہ جائیں اور گنبدِ شیخ لطف اللہ کو دیکھیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ کس طرح علم و ہنر اور صنعت نے دین کی اعانت کی ہے۔ یعنی مذہبی احساسات اور ذوقِ ہنر نے کس طرح ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے اور ایک مذہبی شعار نے کس طرح ہنر اور صنعت کا روپ دھارا ہے۔ خطاطی بھی ایک ہنر ہے۔ نفیس قرآنی کتبے مثلاً وہ کتبہ جو مقصورۂ مشہد کے ایوان میں بایسنقر نے لکھا ہے، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہنر اور صنعت کس طرح مذہبی احساسات کی تقویت کا باعث بن سکتے ہیں۔

خطابت بھی چونکہ ایک ہنر اور فن ہے اور ہنر اور فن معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا شمار معاشرتی عوامل میں ہوتا ہے اس لیے خطابت بھی معاشرتی عوامل میں سے ایک ہے بلکہ اس کا جتنا اثر معاشرے پر ہوتا

ہے کسی اور فن کا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے اگر آپ فن خطابت پر نظر ڈالیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ اس فن کا تعلق بھی اسلام سے ایسا ہی ہے جیسا اور بہت سے فنون کا۔ جس طرح اسلام میں سنگتراش پیدا ہوئے اور سنگتراشی نے ترقی کی، آئینہ بند پیدا ہوئے اور آئینہ بندی نے ترقی کی، گل کار پیدا ہوئے اور پچی کاری اور گل کاری نے ترقی کی۔ اسی طرح اسلام نے اپنے دامانِ عاطفت میں بڑے بڑے خطیبوں کی بھی پرورش کی ہے۔ بہت سے تو خطیب ہی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اسمائے رجال اور تراجم کی کتابوں میں متعدد ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے خطیب کے نام سے شہرت پائی ہے۔ ایک صاحب خطیب رازی تھے، دوسرے خطیب مصری ــــ ایک خطیبِ دمشقی کہلاتے تھے، ایک خطیبِ تبریزی، ایک خطیب حصفکی ــــ یہ سب وہ لوگ تھے جن کی ان کے اور مابعد کے زمانے میں بحیثیت خطیب کے شہرت ہوئی۔ خوش قسمتی سے آج بھی ہمارے یہاں بڑے بڑے مذہبی خطیب موجود ہیں۔ مرحوم سیّد جمال الدین افغانی علاوہ اور خوبیوں کے ایک زبردست خطیب بھی تھے۔ انہوں نے مصر میں اپنے خطبوں کے ذریعے سے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ وہ لوگوں کو رلاتے تھے، ان کی اپنی حالت پر کسی اور چیز پر نہیں۔ اسلام نے اپنے دامن میں بڑے بڑے خطیبوں کی پرورش کی ہے۔ اس کی بھی اپنی تاریخ ہے۔ میں صرف اس قدر اشارہ کرنا چاہتا تھا۔ یہاں تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

بہرحال اس نقطۂ نگاہ سے خطابت کا بھی اسلام سے وہی تعلق ہے جو دوسرے فنون کا ــــ اسلام نے مختلف اقسام کے ہنرمند اور صناع پیدا کیے ہیں۔ ان ہی میں ایک طبقہ خطیبوں اور شاعروں کا بھی ہے۔

خطابت کی ترقی میں اسلام کا اثر

خطابت کی پیشرفت اور ترقی پر اسلام نے براہِ راست جو اثر ڈالا ہے وہ خطابت اور اسلام کے تعلق کا ایک دوسرا رخ ہے۔ اسلام نے نہ صرف فنِ خطابت کو متاثر کیا بلکہ اسے ایک بلند مقام بھی عطا کیا۔ جن فنون کا تعلق زبان سے ہے یعنی شعر گوئی، تحریر اور تقریر ـــ ان میں سے عربوں کو شعر گوئی میں کافی کمال حاصل تھا۔ عرب فطری طور پر شاعر ہیں۔ قبل از اسلام بھی ان میں ممتاز شعراء موجود تھے۔ گو اپنی محدود معلومات کی وجہ سے وہ محدود خیالات ہی کا اظہار اپنے اشعار میں کر سکتے تھے، پھر بھی جن افکار تک ان کی رسائی تھی ان کی حدود میں رہتے ہوئے وہ بہت عمدہ شعر کہتے تھے لیکن خطابت کے میدان میں عربوں کو وہ کمال حاصل نہیں تھا۔ باوجود اس کے کہ زمانۂ جاہلیت کے اشعار کا کافی ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے، خطابت کے بہت کم نمونے ملتے ہیں۔ پھر بھی کچھ نمونے موجود ہیں تیسرے فن یعنی تحریر کا کوئی نمونہ موجود نہیں۔ زمانۂ جاہلیت کی کوئی تصنیف ہمارے پاس نہیں جو اس زمانے کے طرزِ تحریر کی یادگار ہو۔

اسلام نے آکر ان تینوں فنون کو متاثر کیا۔ شعر کے معانی میں وسعت پیدا ہو گئی۔ اگر زمانۂ اسلام کے اشعار کا موازنہ زمانۂ جاہلیت کے اشعار سے کیا جائے تو خیالات میں وسعت کے لحاظ سے نمایاں فرق محسوس ہو گا خطابت میں اسلام نے انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اسلام ہی کی بدولت تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا۔

ایک کتاب ہے جس کا نام "جمہرۃ خطب العرب" ہے۔ اس مجموعہ میں

زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام دونوں ادوار کے وہ خطبے شامل ہیں جو عربوں نے دیئے۔ اگر آپ ان خطبوں پر نگاہ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ خیالات کے لحاظ سے بہت سادہ اور سطحی ہیں لیکن جب آپ اسلامی دور کے خطبے دیکھیں گے تو آپ کو ایک انقلاب سا محسوس ہوگا۔ زمانۂ جاہلیت کے خطبوں میں سے کچھ فقرے اکثم بن صیفی اور مشہور عرب خطیب قس بن ساعدہ ایادی کے نقل ہوئے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ بہت سادہ اور سطحی ہیں۔ جیسے ہی آپ اسلامی دور میں داخل ہوں گے اور آپ کی نظر رسولِ اکرمؐ کے خطبوں پر پڑے گی تو آپ کو ایک اور ہی انداز نظر آئے گا۔ ان میں خیالات مختلف ہیں۔ معارف کا بیان ہے، روحانیت ہے، اجتماعی اور اخلاقی مسائل ہیں، عقل و دانش ہے جبکہ زمانۂ جاہلیت کے خطبوں میں ان سب باتوں کا وجود نہیں تھا۔ اسلام نے زبان سے متعلق تینوں فنون کو متاثر کیا ہے۔ قرآن مجید خود اعجازِ بیان اور فصاحتِ لسان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور بیان کو اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت قرار دیتا ہے:

الرَّحْمٰنُ * عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ * خَلَقَ الْاِنْسَانَ * عَلَّمَهُ الْبَيَانَ *

پیغمبرِ اسلامؐ پر سب سے پہلے جو آیات نازل ہوئیں ان میں قلم اور تحریر کا ذکر ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ * خَلَقَ الْاِنْسَانَ
مِنْ عَلَقٍ * اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ * الَّذِىْ عَلَّمَ
بِالْقَلَمِ * عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ *

اس تعلیم کے نتیجہ میں نہ صرف فنِ خطابت میں انقلاب آیا بلکہ فنِ کتابت کو بھی رواج حاصل ہوا۔ یہ بات بلا سبب نہیں تھی کہ مسلمانوں نے زبان

سے متعلق علوم اور علمِ فصاحت و بلاغت کے قواعد ایجاد کیے۔

اس کے علاوہ خود رسولِ اکرمؐ اور امیر المؤمنینؑ اولین خطیب مانے جاتے ہیں۔ اس وقت موقع نہیں کہ میں ان حضرات کی تقریروں کے کچھ اقتباسات سناؤں اور ان کا موازنہ جاہل عربوں کی تقریروں کے فقروں سے کروں۔

خطابت بحیثیت ایک مذہبی فرض

جس نکتہ کے متعلق میں آج گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور خطابت کے درمیان ایک بہت مضبوط رشتہ ہے اور وہ رشتہ یہ ہے کہ ایک خاص موقع پر خطابت کو دین کا جزو قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ سے سوال کیا جائے تو کیا آپ بتلا سکتے ہیں وہ کونسا موقع ہے؟ جی ہاں ایک موقع ایسا ہے کہ خطابت بھی اسی طرح فرائض میں داخل ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکات، خمس وغیرہ۔ وہ موقع نمازِ جمعہ کا ہے۔

اسلام میں ایک ہفتہ وار نماز ہے جس کا نام نمازِ جمعہ ہے۔ خود قرآن مجید کی سورۂ جمعہ میں اس نماز کا خصوصی تذکرہ ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ *

شیعہ اور سنی تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں ذکر سے نمازِ جمعہ مراد ہے۔

نماز جمعہ کیا ہے؟ وہی ظہر کی نماز جو جمعہ کے دن پڑھی جاتی ہے لیکن یہ نماز اور نمازوں سے مختلف ہے۔ پہلے تو یہ کہ ہر روز نماز ظہر کی چار رکعتیں ہوتی ہیں لیکن نماز جمعہ کی صرف دو۔ رہی اس کی وجہ کہ نماز جمعہ صرف دو

رکعت کیوں ہے۔ یہ بعد میں عرض کروں گا۔ بہرحال نمازِ جمعہ دو رکعت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نماز کو جماعت سے پڑھنا واجب ہے۔ باقی نمازوں یعنی نمازِ فجر، نماز ظہر، نمازِ عصر اور مغرب و عشاء کا جماعت سے پڑھنا واجب نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ جہاں نمازِ جمعہ ہوتی ہے اس کے ہر چہار جانب دو فرسخ تک کے لوگوں پر واجب ہے کہ اس نماز میں شرکت کریں سوائے اس کے کہ کسی عذر کی وجہ سے ایسا نہ کر سکیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جس جگہ نمازِ جمعہ کا اہتمام ہو اس کے ایک فرسخ تک حرام ہے کہ کسی دوسری جگہ نمازِ جمعہ قائم کی جائے۔ صرف وہی ایک نماز ہونی چاہیے۔

اب دیکھیے کہ اگر واقعی ایسی نماز ہونے لگے تو وہ کیسی نماز ہوگی۔ مثلاً تہران میں جس جگہ ہم اس وقت اکٹھے ہیں اگر یہاں نمازِ جمعہ تشکیل دی جائے اور یہاں سے شمال میں شمیران تک اور جنوب میں شہر رے تک اور اسی طرح مشرق اور مغرب میں بارہ کیلومیٹر کے فاصلے تک کے لوگ، کیونکہ دو فرسخ شرعی کے بارہ کیلومیٹر بنتے ہیں، اس نماز میں شرکت کریں اور چھ کیلومیٹر کے فاصلے تک کسی اور جگہ نمازِ جمعہ نہ ہو تو آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ کس قدر عظیم اجتماع ہوگا۔

یہ نماز چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جاتی ہے کیونکہ بکثرت احادیث و اخبار میں آیا ہے اور یہ مسلمات میں سے ہے کہ:

انما جعلت الجمعة رکعتین لمکان الخطبتین۔

یعنی اس نماز میں جو یکجا ادا کی جاتی ہے فرض ہے کہ دو خطبے پڑھے جائیں اور یہی دو خطبے دو رکعت کے قائم مقام ہیں۔

یہی وہ بات ہے جو میں نے عرض کی تھی کہ خود دینِ اسلام میں ایک موقع

ایسا ہے کہ جہاں تقریر یا خطبہ جزو دین ہے، جزو نماز ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خطبہ خود نماز ہے۔ جب تک امام خطبہ پڑھتا رہے اور منبر سے نیچے نہ اترے لوگوں کو خاموشی سے اس کی طرف متوجہ ہو کر خطبہ سننا چاہیے گویا کہ وہ حالتِ نماز میں ہیں۔ البتہ کچھ فرق بھی ہیں۔ مثلاً قبلہ رو ہو کر بیٹھنا یا خود امام کا جب وہ خطبہ پڑھ رہا ہو قبلہ رو ہونا واجب نہیں ہے۔ بہر حال اس موقع پر جو دو خطبے فرض ہیں وہ نمازِ ظہر کی دو رکعتوں کی جگہ پر ہیں۔

جمعہ کے اجتماع کا اصل مقصد

آپ ان اسلامی احکام پر جو آپ نے پہلے نہیں سنے یا بہت کم سنے ہیں تعجب کریں گے اور پوچھیں گے کہ جمعہ کے اس اجتماع اور اس کے ان سب آداب کا مقصد کیا ہے۔ آپ کو اور زیادہ تعجب ہوگا جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اس اجتماع کا بڑا مقصد ان ہی خطبوں کا سننا ہے۔ اس سے سمجھ لیجیے کہ یہ خطبے کس قدر اہم اور کیسے ضروری ہیں۔ ان کی اس قدر اہمیت ہے کہ جیسے ہی مؤذن تکبیر کی صدا بلند کرے، جو شخص جہاں بھی ہو اور جو کام بھی کر رہا ہو اس کام کو چھوڑ کر نماز جمعہ کے لیے لپکے اور پہلے ان دونوں خطبوں کو سنے اور پھر دو رکعت نماز با جماعت پڑھے۔ اس کے بعد وہ آزاد ہے۔ سورۂ جمعہ میں اس کا بیان ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ

إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ * فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ -

یہ بھی بتاتا چلوں کہ ظہر کی نماز میں پہلے ظہر کے وقت اذان ہوتی ہے اور پھر نماز پڑھی جاتی ہے لیکن جمعہ کے دن اگر نماز جمعہ پڑھنی ہو تو اذان، ظہر کے وقت سے پہلے دی جاتی ہے ہونا یہ چاہیے کہ اذان اس طرح دی جائے کہ زوال آفتاب شروع ہونے تک دونوں خطبے پورے ہو جائیں۔

جیسے ہی نماز جمعہ کے لیے مؤذن کی صدا بلند ہو اس کے بعد خرید و فروخت حرام ہے۔ نصِ قرآنی ہے وَذَرُوا الْبَيْعَ ۔ یہ اسلام کے مسلمات میں سے ہے۔ اس بارے میں شیعہ اور سنی کا کوئی اختلاف نہیں کہ اگر کہیں صحیح طریقے سے جمعہ کی نماز ہوتی ہو اور اذان ہو جائے تو مثلاً اگر کوئی دکاندار ترازو کے پاس بیٹھا یا کھڑا ہے اور گاہک مثلاً اس سے پنیر خرید رہا ہے اور وہ چھری لیے ہوئے پنیر کاٹ رہا ہے تو جیسے ہی اللہ اکبر کی آواز بلند ہو، دکاندار اور گاہک دونوں پر واجب ہے کہ ہاتھ روک لیں اور فوراً نماز کے لیے لپکیں۔

فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ -

یعنی دوڑو نماز کی طرف اور چھوڑ دو خرید و فروخت۔

اس وقت خرید و فروخت حرام ہے۔ لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ فوراً جا کر خطبہ سنیں۔

جمعہ کی نماز میں ایک نہیں دو خطبے ہوتے ہیں۔۔۔ اس طرح کہ امام ایک خطبہ پڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور ذرا سی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر اٹھ کر دوسرا خطبہ پڑھتا ہے۔

جمعہ کے خطبوں کا موضوع

یہ تو معلوم ہو گیا کہ جمعہ کے خطبہ کی کتنی اہمیت ہے کہ اس اجتماع کا خاص مقصد ہی ان خطبوں کو سننا ہے۔ رہی یہ بات کہ ان خطبوں یا تقریروں میں کیا کہا جائے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اول حمد و ثنائے الٰہی، اس کے بعد خاتم الانبیاء اور ائمۂ دین پر درود و سلام، پھر وعظ اور وہ ضروری مضامین جن کی تشریح میں بعد میں کروں گا اور اس کے بعد قرآن کی ایک سورت کی تلاوت۔ یہ وہ مواد ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔

یہ سمجھنے کے لیے کہ اس اجتماع میں حاضری کس قدر اہم ہے، اس روایت پر غور کیجیے جس کے مطابق یہ واجب ہے کہ قیدیوں کو بھی پولیس اور جیل کے اہل کار اپنے ساتھ لائیں اور انہیں اس ہفتہ وار عام اجتماع میں شرکت کا موقع دیں۔ قیدیوں کو اپنے ساتھ حراست میں لائیں اور ان کو نگرانی میں رکھیں تاکہ انہیں فرار ہونے کا موقع نہ مل سکے یعنی یہ ضروری ہے کہ قیدی کو جیل سے باہر لایا جائے تاکہ وہ نمازِ جمعہ، جماعت کے ساتھ ادا کرے، خطبہ سنے اور پھر اپنی جگہ واپس چلا جائے۔

امامِ جمعہ و جماعت کے لیے بھی کچھ آداب مقرر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ سر پر عمامہ باندھے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی مختصر سی شال وغیرہ جس کے دو تین پیچ ہوں، سر پر رسول اللہؐ کے عمامہ کی طرح لپیٹ لے۔

اللہ، جناب حاجی رحیم اربابِ اصفہانی کو زندہ و سلامت رکھے۔ شاید آپ میں سے بہت سے ان کو جانتے بھی ہوں۔ وہ فقہ، اصول، فلسفہ اور قدیم ریاضیات کے بڑے علماء میں سے ہیں اور مرحوم جہانگیر خان قشقائی

کے شاگرد رہے ہیں۔ مرحوم جہانگیر خاں ہی کی طرح وہ ابھی تک کھال کی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ باقی سب لحاظ سے ان کا لباس دیگر علماء ہی کی طرح ہے وہی عبا قبا وہی حلیہ۔ صرف ٹوپی کھال کی اوڑھتے ہیں۔ وہ نماز جمعہ کے بڑے معتقد ہیں اور اصفہان میں خود نماز جمعہ پڑھاتے ہیں لیکن لوگ چونکہ عموماً نماز جمعہ میں دلچسپی نہیں رکھتے اس لیے جس شان سے ہونی چاہیے وہ نہیں ہوتی۔ وہ جب جمعہ کی نماز کے لیے آتے ہیں تو ایک مختصر سا عمامہ یعنی دو تین پیچ کی ایک شال سر پہ باندھ کر آتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں فروردین ۱۳۳۹ھ میں اصفہان میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو جمعہ کی نماز کا تذکرہ آگیا۔ فرمانے لگے معلوم نہیں کہ شیعہ کب نماز جمعہ کے ترک کا الزام اپنے اوپر سے دور کریں گے۔ سب اسلامی فرقے ہم پر اعتراض کرتے ہیں اور ہمارا مذہبی مذاق اڑاتے ہیں کہ ہم نے جمعہ کی نماز ترک کر رکھی ہے۔ وہ اس بات کی تمنّا کرتے تھے کہ کاش قم کی سب سے بڑی مسجد میں چند ملین تومان خرچ کر کے شاندار طریقے سے نماز جمعہ ادا کی جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام کھڑے ہو کر خطبہ پڑھے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَاِۨ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا۔ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ۔ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔ (سورۂ جمعہ: آیت ۱۱)

یعنی ان غیر تربیت یافتہ لوگوں میں ابھی تک جاہلانہ عادات اور رسوم باقی ہیں۔ جیسے ہی ان کی نظر مالِ تجارت پر پڑتی ہے یا ڈھول کی آواز ان کے کان میں آتی ہے یہ آپ کو کھڑا ہوا

چھوڑ کر ان چیزوں کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔

اس آیت میں درج ذیل قصے کی طرف اشارہ ہے:

ایک روز رسولِ خدا کھڑے ہوئے جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ ڈھول کی آواز آئی جو اس بات کی علامت تھی کہ سامانِ تجارت آگیا ہے۔ لوگ اس ڈر سے کہ کہیں سامان ختم نہ ہو جائے، پیغمبرؐ کو کھڑا ہوا چھوڑ کر چلے آئے۔

مقصد اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ وَتَرَكُوكَ قَائِمًا یعنی "آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ دیا" سے ظاہر ہے کہ آپ کھڑے ہو کر خطبہ پڑھ رہے تھے، کہتے ہیں کہ بیٹھ کر خطبہ پڑھنے کی بدعت معاویہ کی ایجاد ہے۔

رہی یہ بات کہ جمعہ کی نماز کا امام اور خطیب ایک ہی شخص ہونا چاہیے یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ خطیب کوئی اور ہو اور امامِ جماعت کوئی اور؟ تو یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اکثریت اسی کی قائل ہے کہ خطیب اور امامِ جماعت ایک ہی ہونا چاہیے، بلکہ بعض کے نزدیک امامِ جمعہ کی اولین شرط یہی ہے کہ وہ خطبہ دینے کے قابل ہو۔ اکثر روایات میں اس بات کو امام یخطب کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ جب امام خطبہ کے لیے کھڑا ہو، تلوار، نیزہ یا عصا پر ٹیک لگائے اور اسی حالت میں خطبہ دے۔

جمعہ کے خطبہ کے بارے میں

امام ہشتم کی روایت

جمعہ کے خطبہ میں حمد و ثنائے الٰہی، ذکرِ رسولِ اکرمؐ، ائمۂ اطہارؑ اور

قرآن کی ایک سورت کی تلاوت کے علاوہ یہ ضروری ہے کہ خطیب وعظ و نصیحت کرے اور جو باتیں مسلمانوں کے لیے ضروری ہوں، ان کو بیان کرے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ جمعہ کے خطبہ میں کن مضامین کا بیان ضروری ہے ہمیں ایک روایت سے ہدایت ملتی ہے۔

وسائل الشیعہ جلد اوّل میں ان احادیث کے ضمن میں جو خطبۂ جمعہ سے متعلق ہیں ایک حدیث علل الشرائع اور عیون اخبار الرضا کے حوالے سے نقل ہوئی ہے۔ اس حدیث کو فضل بن شاذان نیشاپوری نے جو ہمارے اکابر اور ثقہ رواۃ میں سے ہیں امام علی رضا علیہ السلام سے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے:

انّما جُعلتِ الخطبة یوم الجُمعة لانّ الجمعة مشهدٌ عامٌّ۔ یعنی جمعہ کے دن خطبہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ جمعہ عام اجتماع کا دن ہے اور اس دن سب لوگوں کو اس اجتماع میں شرکت کرنی چاہیے۔

فاراد ان یکون للامیر سبب الی موعظتهم وترغیبهم فی الطاعة وترهیبهم من المعصیة۔

اللہ تعالےٰ نے یہ قاعدہ اس لیے مقرر کیا ہے تاکہ قوم کا امیر اپنی جماعت کے سامنے وعظ کہہ سکے، انہیں طاعت کی ترغیب دے سکے اور گناہوں کے برے نتائج سے ڈرا سکے۔

وتوقیفهم علیٰ ما اراد من مصلحة دینهم ودُنیاهم۔

اور ساتھ ہی انہیں آگاہ کر سکے کہ ان کے دینی اور دنیاوی مفاد کا تقاضا کیا ہے اور انہیں بتلا سکے کہ درحقیقت ان کی

بھلائی کس بات میں ہے۔

وَیُخبِرُھُم بِمَا یَردُ علیھم مِنَ الآفاق مِنَ الاحوال التی فیھا المضرّة والمنفعة۔ مزید یہ کہ دور دراز علاقوں میں مسلمانوں پر جو اچھی بری گزرے اس کی اطلاع دے سکے جو واقعات عالمِ اسلام میں پیش آتے ہیں کبھی تو وہ مسلمانوں کے لیے ایک طرح کی خوشخبری ہوتے ہیں مثلاً اگر اسلام کو کوئی کامیابی اور ترقی حاصل ہو تو اس صورت میں مناسب ہے کہ لوگوں کو آگاہ کیا جائے اور کبھی عالمِ اسلام کو کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے، اس صورت میں بھی ضروری ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے حال سے واقف ہوں مثلاً انہیں معلوم ہو کہ اس ہفتہ فلسطین یا دنیا کے کسی اور مقام پہ کیا گزری۔

رہی یہ بات کہ دو خطبے کیوں پڑھے جائیں۔ ایک ہی کیوں کافی نہیں اور آیا ان دو خطبوں میں کچھ فرق ہے؟ اس کے متعلق بھی اسی حدیث میں ہے کہ:

وانما جُعلت خُطبتین لتکون واحدة للثناء علی اللہ والتحمید والتقدیس للہ عزّوجلّ والاُخریٰ لِلحوائجِ والاعذارِ والانذارِ والدعاءِ لما یریدُ ان یعلّمھم من امرہٖ ونھیہٖ وما فیہ الصّلاح والفساد۔

یعنی اس کی وجہ کہ دو خطبے کیوں فرض ہوئے یہ ہے کہ ایک میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تقدیس و تمجید بیان کی جائے اور

دوسرے میں لوگوں کی ضروریات کا تذکرہ کیا جائے اور ان کو وعظ و نصیحت کی جائے لیکن جیسا کہ صاحب وسائل الشیعہ نے کہا ہے کہ اس کی ہمیشہ ضرورت نہیں ہوتی۔

میں نے آج یہ سب گفتگو خطبہ و منبر کی بحث میں یہ بتانے کے لیے کی ہے کہ اسلام میں ایک حکم ایسا بھی ہے جس کی روح سے خطابت جزو دین قرار پاتی ہے۔ رہی یہ بات کہ شیعوں میں اس کا رواج کیوں نہیں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ مجھے خود یقین نہیں آتا کہ اس بابرکت اور اہم نماز کی شرائط کو اس قدر سخت اور محدود کیوں سمجھا گیا کہ یہ عملاً منسوخ اور متروک ہو گئی۔

اسلام میں وعظ

مجھے ایک بات اور کہنی ہے اور یہ وعظ کا سوال ہے۔ وعظ اور خطابت میں کچھ فرق ہے۔ خطابت ایک ہنر ہے اور اس کا ایک فنی پہلو ہے۔ اس کے علاوہ خطابت کا مقصد جذبات اور احساسات کو کسی نہ کسی طرح برانگیختہ کرنا ہے۔ مگر وعظ کا مقصد نفسانی خواہشات کو ٹھنڈا کرنا ہے اور اس کا نمایاں پہلو برائیوں سے روکنا اور تنبیہہ کرنا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ خطابت کا مقصد مطلقاً قائل کرنا ہے تو پھر وعظ بھی خطابت ہی کی ایک قسم ہے۔ بہرحال وعظ کا لفظ وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں ایسے فقرے استعمال کیے جائیں جن کا مقصد تنبیہہ کرنا، روکنا اور بوقتِ ضرورت شہوت اور غصہ کو ٹھنڈا کرنا ہو۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ الوعظ زجرٌ مقترن بالتخویف۔ یعنی وعظ کے معنی روکنا ہیں ڈرانے کے ساتھ یعنی انجام سے ڈرانا۔ پھر مشہور لغوی خلیل بن احمد کا قول نقل کرتا ہے: ھو التذکیر بالخیر فیما یرقّ له القلب۔ یعنی

وعظ نیک کاموں کی یاد دہانی ہے ایسے طریقے سے کہ دل نرم پڑ جائے۔ لہٰذا وعظ وہ تقریر ہے جو رقّتِ قلب پیدا کرے۔

لوگوں کو ہوا پرستی، شہوت رانی، سود خوری، ریا کاری سے روکنا اور موت، قیامت اور دنیا و آخرت میں اعمال کے اچھے برے نتائج کی یاد دلانا وعظ ہے۔

اس کے برخلاف خطابت کی مختلف اقسام ہیں۔ کبھی اس کا مقصد جوش دلانا اور جنگ پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ کبھی اس کا مقصد سیاسی ہوتا ہے۔ کبھی عدالت کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔ کبھی اس کا استعمال دینی اور اخلاقی مقاصد کے لیے ہوتا ہے۔ کبھی میدانِ جنگ میں سپاہیوں کی ہمّت بڑھانے کے لیے، کبھی لوگوں کو ان کے سیاسی اور سماجی حقوق سے آگاہ کرنے کے لیے، کبھی رحم کے جذبات ابھارنے کے لیے، جیسے مثلاً وہ تقریریں جو وکیل عدالت میں مجرم کی سزا میں تخفیف کرانے یا رحم کی درخواست کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ اسی طرح کبھی اس کا مقصد دینی و اخلاقی شعور کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں خطابت سے زیادہ وعظ کا رواج ہے۔ حالانکہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا خطابت کی بہت سی اقسام موجود ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں وعظ کا زیادہ رواج ہے۔ ہماری مجالس زیادہ تر وعظ کا رنگ رکھتی ہیں اور نمازِ جمعہ جس کے خطبوں میں مختلف رنگ ہو سکتے تھے ہمارے یہاں متروک ہے۔

مجالسِ وعظ کے نام سے جو چیز ہمارے یہاں باقی ہے وہ ان مجالس کی یادگار ہے جو صوفیوں نے ایجاد کی تھیں یعنی یہ کہ باقاعدہ مجلس تشکیل دی جاتے۔ کچھ لوگ سننے کے لیے جمع ہوں اور ایک شخص باقاعدہ واعظ و ناصح

کی حیثیت سے گفتگو کرے۔ بظاہر یہ صوفیوں کی ایجاد ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی اس لیے بعد میں دوسروں نے بھی ایسی مجالس منعقد کیں۔ ہمارے یہاں صدیوں سے ایسی کتابیں موجود ہیں جو مجالسِ وعظ کے نام سے ترتیب دی گئی تھیں، جیسے مجالسِ سعدی اور مجالسِ رومی وغیرہ۔ یہ ایک اچھا کام تھا بعد میں دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی شیعوں نے سیدالشہداء کی عزاداری اور مرثیہ خوانی کی مجالس کو رواج دیا۔ یہ بھی بہت اچھا کام کیا۔

میرا خیال ہے کہ مجالسِ وعظ چونکہ ابتداء میں صوفیوں کی تقلید میں شروع ہوئی تھیں اور تصوّف کی بنیاد چونکہ نفسانی خواہشات کو دبانے اور تہذیب و تزکیۂ نفس پر ہے اس لیے یہ موضوع وعظ سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ ہمارے خطیب اگرچہ صوفی نہیں ہیں تاہم وہ بھی زہد اور ترک ہوا و ہوس ہی کے پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

نہج البلاغہ کے وعظ اور خطبے

نہج البلاغہ میں جو امیرالمومنین کے کچھ خطبات کا مجموعہ ہے، مختلف اقسام کے خطبے شامل ہیں۔ اس میں مؤثر مواعظ بھی ہیں اور پرجوش خطبات بھی۔ مفتی اعظم مصر شیخ محمد عبدہٗ نے نہج البلاغہ کی ایک مختصر شرح اور اس کا مقدمہ لکھا ہے۔ وہ اپنے مقدمہ میں یوں رقمطراز ہیں:

> "جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے اس میں انواع و اقسام کی عبارت ملی جس نے مجھے حد درجہ متاثر کیا۔
> اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر میری آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے۔

کبھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ لوگ شیر اور چیتے کی کھالیں پہنے حملہ کے لیے تیار ہیں۔ میں خود اس قدر متاثر تھا کہ میرا دل چاہنے لگتا تھا کہ میں بھی میدانِ جنگ میں جا کر دشمنوں کا خون بہاؤں اور خود بھی چرکے پر چرکا کھاؤں۔ پھر دیکھتا تھا کہ منظر بدل گیا۔ میں ایک واعظ کے روبرو ہوں جو اپنی باتوں سے دلوں کو نرمی اور لطافت بخش رہا ہے، انہیں پاکیزگی اور صفائی عطا کر رہا ہے۔ پھر اچانک ایک اور منظر آتا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ ایک سیاست داں اور سماجی مصلح کھڑا ہوا عوام کے مفاد کی بات کر رہا ہے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک فرشتہ عالم بالا سے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے اور چاہتا ہے کہ لوگوں کو عالم بالا کی طرف کھینچ لے۔"

یہ واقعہ ہے کہ نہج البلاغہ میں انواع و اقسام کے خطبے ملتے ہیں۔ ان میں وعظ و نصیحت بھی ہے، توحید و معرفت کا بیان بھی۔ ان میں سیاسی خطبے بھی ہیں اور رزمیہ خطبے بھی۔ یہاں میں نمونہ کے طور پہ ایک رزمیہ خطبے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نقل کرتا ہوں۔

جنگِ صفین میں لشکرِ علی اور لشکرِ معاویہ ایک دوسرے کے مقابل پہنچتے ہیں۔ حضرت علیؑ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ لشکرِ معاویہ نے پیش قدمی کر کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا ہے اور ہمارا پانی روک دیا ہے۔ ہمیں اجازت دی جائے کہ فوراً جنگ شروع کر دیں تاکہ گھاٹ پر دوبارہ قبضہ کر سکیں۔

آپ نے فرمایا: ٹھہرو! ممکن ہے ہم بات چیت کے ذریعہ اس قضیے کا حل نکال لیں۔ آپ نے خط لکھ کر قاصد کے ہاتھ بھیجا کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں

لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ ہتھیار استعمال کرنے کی بجائے مذاکرات کے ذریعہ سے اختلافات کو دور کیا جائے۔ تم نے سب سے پہلے بڑھ کر ہمارے لشکریوں کا پانی بند کر دیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اپنے آدمیوں کو فوراً حکم دو کہ پانی کھول دیں۔ معاویہ نے اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا بلکہ گھاٹ پر قبضہ کو اپنے لیے کامیابی تصور کیا۔ عمرو بن عاص نے جو معاویہ کا وزیر و مشیر تھا کہا بھی کہ آپ حکم جاری کر دیجیے کہ مزاحمت نہ کریں۔ علیؑ ایسے آدمی نہیں کہ پیاسے رہیں اور گھاٹ کا قبضہ نہ لے سکیں۔ مگر معاویہ نہیں مانا۔ بالآخر چند بار قاصدوں کی آمد و رفت کے بعد علیؑ مجبور ہو گئے کہ حکم دیں کہ حملہ کر کے معاویہ کے لشکریوں کو پیچھے دھکیل دیا جائے۔

یہاں موقع تھا جوش دلانے اور غیرت و حمیت کو ابھارنے کا۔ حضرت علیؑ کے تین چار ہی جملوں نے وہ جوش و خروش پیدا کیا کہ ذرا سی دیر میں معاویہ کی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ جب بھی میں یہ جملے پڑھتا ہوں میرے بدن میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جملے یہ ہیں:

قد استطعموکم القتال یعنی ان لوگوں نے پیش قدمی کی ہے اور جس طرح کوئی بھوکا غذا تلاش کرتا ہے، یہ تم سے جنگ کے خواہاں ہیں۔

فاقرّوا علیٰ مذلةٍ و تاخیر محلّةٍ او روّوا السیوفَ من الدماءِ تُرووا من الماءِ۔ اس لیے اب صرف دو راستے ہیں یا تو ذلت، پستی اور عقب نشینی برداشت کرو یا ان نابکاروں کے خون سے اپنی تلواروں کو سیراب کرو تا کہ تم پانی سے سیراب ہو سکو۔

فانّ الحیوة فی موتکم قاهرین والموت فی

حیاتکم مقھورین۔ زندگی اس میں ہے کہ تم جان دیدو
اور کامیاب و کامران ہو کر غالب آؤ اور موت اس میں ہے
کہ تم زندہ رہو مگر مغلوب و مقہور ہو کر۔

ان چند جملوں سے لشکریانِ امام کی غیرت و حمیت کو وہ جوش آیا کہ انہوں نے تھوڑی ہی دیر میں معاویہ کے ساتھیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔

اب میں ایک دو فقرے علیؑ کے فرزندِ عزیز حسینؑ بن علیؑ کے خطبوں میں سے بھی بطور نمونہ پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ گو آجکل ہمارے یہاں جمعہ کے خطبہ کا رواج نہیں لیکن امام حسینؑ کی برکت سے خطبے اور منبر باقی ہیں۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی خطبے ہیں لیکن ہمارے ملک میں دینی خطبوں کی بنیاد عزاداریٔ حسینؑ بن علیؑ پر قائم ہے۔

حسینی خطبے

ابو عبداللہ ہر معاملے میں اپنے والدِ بزرگوار کے قدم بہ قدم تھے۔ یہی صورت ان کی خطابت کی بھی تھی لیکن ابو عبداللہ کو اتنا موقع بھی نہیں ملا جتنا امیر المؤمنینؑ کو اپنے دورِ خلافت میں ملا تھا۔ تھوڑا سا موقع جو ابو عبداللہ کو ملا وہ اس سفر کے دوران میں تھا جو آپ نے مکّہ سے کربلا تک فرمایا یا پھر ان آٹھ دنوں میں جب آپ کا قیام کربلا میں رہا۔ اس تھوڑی سی مدّت ہی میں آپ کے جوہر کھُلے۔ جو خطبے آپ کے اس وقت موجود ہیں، وہ بیشتر اسی مدّت میں دیے گئے تھے۔ امام حسینؑ کے خطبے اپنے والدِ بزرگوار کے خطبوں کا بعینہ نمونہ ہیں۔ ان کی روح وہی ہے اور وہی معانی ان میں موجزن ہیں۔

خود امام علیؑ نے فرمایا تھا کہ زبان روح کا آلہ ہے۔ اگر معانی زبان پر نازل نہ ہوں تو زبان کیا کام دے سکتی ہے لیکن اگر معانی روح میں موجزن ہوں تو پھر زبان ان کو نہیں روک سکتی۔ آپ نے فرمایا ہے: وانّا لأمراءُ الکلام وفینا تنشّبت عروتهٗ وعلینا تھدّلت غصونهٗ۔ ہم امیرِ سخن ہیں۔ اس کی جڑیں ہمارے وجود میں پیوست ہیں اور اس کی شاخیں ہمارے سر پر سایہ فگن ہیں۔

حسین بن علی علیہما السلام کا پہلا خطبہ جو کمالِ فصاحت و بلاغت کا مظہر اور ذکاوت و شجاعت اور بلند نظری اور ایمان بالغیب سے مالامال ہے۔ وہ خطبہ ہے جو آپ نے مکہ میں اس وقت دیا جب آپ کربلا کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ اس میں آپ نے اپنے مصمّم عزم کا اعلان کیا اور ضمناً یہ بھی فرمایا کہ جو شخص ہمارا ہم فکر و ہم عقیدہ ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔

خطّ الموتُ علیٰ وُلدِ اٰدم مخطّ القلادۃِ علیٰ جید الفتاۃ وما اولھنی الیٰ اسلافی اشتیاق یعقوبؑ الیٰ یوسفؑ۔

موت نے فرزندانِ آدم کو اس طرح نشان زدہ کر دیا ہے جس طرح گلوبند کا نشان جوان عورت کی گردن پر پڑ جاتا ہے میں اپنے اسلاف سے ملاقات کا اسی طرح مشتاق ہوں جس طرح یعقوب یوسف سے ملاقات کے مشتاق تھے۔

من کان باذلاً فینا مھجتهٗ موطّناً علیٰ لقاءِ اللہ نفسهٗ فلیرحل معنا، فانّی راحلٌ مُصبحاً ان شاء اللہ۔

جو شخص ہمارے لیے جاں نثاری پر آمادہ ہو اور اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے تیار ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔ میں انشاءاللہ کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔

خُطبہ اور منبر

(۲)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلرَّحْمٰنُ * عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ * خَلَقَ الْاِنْسَانَ * عَلَّمَہُ الْبَیَانَ *

میں نے پچھلے لیکچر میں خطابت اور اسلام کے تعلق اور اس تغیر کے بارے میں گفتگو کی تھی جو اسلام نے خطابت میں پیدا کیا۔ میں نے اس ضمن میں اس اسلامی حکم کا بھی تذکرہ کیا تھا جس کے مطابق اسلام نے ایک خاص طرز کے خطبہ کو اسلامی تعلیمات کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ گو ہمارے ملک میں خطبہ اور منبر کا وجود فاجعۂ کربلا کی وجہ سے ہے لیکن چونکہ میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنا چاہتا تھا اس لیے اس ضمن میں نماز جمعہ کی بحث ناگزیر تھی۔ اس کے علاوہ میں نے ان آداب و قواعد کا بھی تذکرہ کیا تھا جو خطبۂ جمعہ کے باب میں وارد ہوئے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ جب میں دوبارہ خطبہ کے بارے میں گفتگو کروں تو یہ بھی تجویز پیش کر سکوں کہ ہمیں آج بھی ان احکام پر عمل کرنا چاہیے۔

دنیائے شیعیت میں خطابت کا واقعۂ کربلا سے رشتہ

میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ملک میں خطبہ و منبر کا وجود شہادت عظمیٰ کا رہین منت ہے۔ وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام نے اپنے زمانے میں مروّجہ نظام کے خلاف تحریک چلائی اور شہید ہوئے۔ سید الشہداء کی عزاداری کے بارے میں ایسی روایات آئی ہیں کہ کوئی شیعہ ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ عزاداری شیعہ مذہب کے مسلّمات میں سے ہے۔ ائمۂ اطہار علیہم السلام نے بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے کہ عاشورے کی یاد کو قائم رکھا جائے۔ شعراء کو ہدایت کی گئی ہے کہ اس موضوع پر شعر کہیں اور لوگوں کے احساسات کو جھنجھوڑیں۔ جو لوگ عاشورے کی یاد سے متاثر ہو کر آنسو بہاتے ہیں ان کے اس فعل کو مقدّس قرار دیا گیا ہے۔ بکثرت احادیث ہیں گریہ و بکا کی فضیلت آئی ہے۔ آج میں یہ احادیث سنانا نہیں چاہتا لیکن اجمالاً اتنا عرض کرتا ہوں کہ کسی شیعہ کے لیے انکار کی گنجائش نہیں کہ ہمارے مذہب میں یہ حکم ہے۔

یہاں دو امور پر گفتگو ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ امام حسینؑ کے قیام کا فلسفہ کیا تھا؟ امام حسینؑ نے قیام کیوں کیا؟ ان کے قیام کا محرک کیا تھا؟ دوسرے یہ کہ ائمۂ دین نے یہ تاکید کیوں کی ہے کہ امام حسینؑ کے قیام کی یاد ہمیشہ یاد رکھی جائے اور بھلائی نہ جائے۔ آخر عاشورے کے موضوع کو زندہ رکھنے کا فلسفہ کیا ہے؟

ہم شیعوں کے عقیدے کے مطابق دین کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ اس لیے ان دونوں باتوں کی بھی حکمت معلوم ہونی چاہیے۔ اگر یہ حکمت معلوم ہو جائے تو اس وقت معلوم ہو گا کہ ان احکام کی کیا اہمیت ہے اور واقعۂ کربلا سے متعلق احکام سے ہمیں کس قدر زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

امام حسینؑ نے قیام کیوں کیا؟ اس کی تین طرح سے توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ امام حسینؑ کا قیام ایک معمولی واقعہ تھا جس کا مقصد معاذ اللہ محض ذاتی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش تھا مگر یہ ایسی توجیہہ ہے جس کو کوئی مسلمان ہرگز پسند نہیں کر سکتا اور نہ تاریخی واقعات ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

دوسری توجیہہ وہ ہے جو اکثر عوام الناس کے ذہن میں آتی ہے کہ اس اُمت کے گناہوں کو بخشوانے کے لیے امام حسینؑ نے جان دی اور شہید ہوئے یعنی آپ کی شہادت دراصل اس امت کے گناہوں کا کفّارہ ہے۔ یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جیسی کہ عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے بارے میں گھڑلی ہے اور اپنا عقیدہ بنالیا ہے کہ اپنی امت کے گناہوں کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے حضرت عیسیٰؑ صلیب پر چڑھ گئے۔ بالفاظِ دیگر امام حسینؑ اس لیے شہید ہوئے کہ گنہگاروں کو آخرت میں جو سزا ملتی تھی وہ نہ ملے تاکہ لوگ آزادی سے گناہ کر سکیں۔ اس عقیدہ کا مطلب یہ ہوا کہ امام حسینؑ نے دیکھا کہ کچھ یزید، ابن زیاد، شمر اور سنان ہیں تو سہی لیکن ان کی تعداد کم ہے لہٰذا انہوں نے سوچا کہ کوئی کام ایسا کیا جائے کہ ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے یزید سازی اور ابن زیاد سازی کا کارخانہ قائم کر دیا تاکہ یہ آئندہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہو سکیں۔ یہ طرزِ فکر اور یہ توجیہہ انتہائی خطرناک

ہے۔امام حسینؑ کی تحریک کے اثر کو زائل کرنے، ان کے مقاصد کے خلاف نبرد آزما ہونے اور عزاداریٔ امام حسینؑ کے متعلق جو احکام ہمیں ملے ہیں ان کو بے اثر بنانے اور غیر معقول ثابت کرنے کا اس طرزِ فکر سے زیادہ مؤثر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ آپ یقین کریں کہ ہم جو اعمال کی بجا آوری میں اتنے بے پروا اور لاابالی واقع ہوئے ہیں اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ امام حسینؑ کی تحریک کی اتنی غلط توجیہہ کی گئی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ایک وجہ کہا کیونکہ اور بھی وجوہات ہیں جن کا تعلق قومی اور نسلی پہلو سے ہے۔

مرجئہ کا عقیدہ تھا کہ ایمان اور اعتقاد کافی ہے۔ نجات کے لیے عمل کی کوئی قید نہیں۔ اگر عقیدہ درست ہے تو خداوند بے نیاز ہر بدعملی کو معاف کر دے گا۔ اس فرقہ کے بارے میں جناب زید بن علی بن الحسینؑ نے کہا تھا کہ هٰؤُلَاءِ اطعموا الفسّاق فی عفو اللہِ۔ یعنی ان لوگوں کی حرکت سے اس بھروسے پر کہ اللہ معاف کر دے گا فسّاق کی جرأت بڑھ گئی ہے کہ وہ جتنے چاہیں گناہ کریں۔ یہ اس وقت مرجئہ کا عقیدہ تھا شیعوں کا عقیدہ اس زمانے میں اس کے بالکل برعکس تھا لیکن آج شیعہ بھی وہی کہتے ہیں جو زمانۂ قدیم میں مرجئہ کہتے تھے۔ اس وقت تو شیعوں کا عقیدہ اس نصِ قرآنی کے مطابق تھا اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یعنی ایمان بھی ضروری ہے اور عمل صالح بھی۔

تیسری توجیہہ یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ امام حسینؑ نے اٹھ کھڑے ہونا اپنا فرض سمجھا۔ ان کی رائے میں اسلام کی بقاء کے لیے ان کا اپنا قیام ضروری

اوران کا فرض تھا۔ خلیفۂ وقت سے ان کا اختلاف اور نزاع اس بات پر نہیں تھا کہ تو خلیفہ ہو یا میں خلیفہ ہوں یا تو جس منصب پر فائز ہے وہ مجھے ملنا چاہیے۔ اختلاف بنیادی اور اصولی تھا۔ اگر یزید کی بجائے کوئی اور شخص بھی یہی کام کرتا اور یہی روش اختیار کرتا تو امام حسینؑ اس کے خلاف بھی اسی طرح قیام کرتے چاہے اس شخص کا سلوک خود امام حسینؑ کے ساتھ اچھا ہوتا یا برا ہوتا۔ یزید اور اس کے اعوان و انصار بھی امام حسینؑ کی ہر قسم کی اعانت کے لیے تیار تھے بشرطیکہ امام عالیمقام ان کے کاموں سے تعرض نہ کریں اور ان کی روش پر صاد کردیں۔ اگر امام کوئی علاقہ مانگتے، مثلاً یہ کہتے کہ حجاز و یمن کی حکومت مجھے دیدو یا عراق کی یا خراسان کی حکومت میرے حوالے کردو تو وہ یہ علاقہ ضرور دے دیتے۔ بلکہ اگر امام چاہتے تو اس علاقہ میں حکومت کا کلّی اختیار بھی انہیں مل جاتا۔ جتنی چاہیے وصولی کرتے اور جس طرح چاہتے خرچ کرتے۔ اگر دل چاہتا تو کچھ رقم مرکزی حکومت کو بھیج دیتے اور نہ چاہتے تو نہ بھیجتے۔ مگر درحقیقت امام حسینؑ کی جنگ مسلک و عقیدہ کی جنگ تھی، حق و باطل کی جنگ تھی اور حق و باطل کی اس جنگ میں خود امام حسینؑ کی اپنی ذات کی حیثیت ثانوی تھی۔ آپ نے خود چند مختصر الفاظ میں یہ بات اپنے اصحاب پر واضح کردی تھی۔ ایک خطبہ میں آپ نے فرمایا تھا اور غالباً اس وقت فرمایا تھا جب حُر اور ان کے ساتھی پہنچ گئے تھے۔ اس بنا پر یہ خطاب عام تھا۔

آپ نے فرمایا تھا:-

الا ترون ان الحق لا یعملُ به والباطلَ لا یتناهیٰ عنه لِیرغب المؤمن فی لقاء الله محقًّا -

کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل سے اجتناب

نہیں کیا جاتا؟ ان حالات میں ہر مومن کا فرض ہے کہ شہادت کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا لِيَرْغَبِ الْاِمَامُ یعنی امام کا فرض ہے کہ شہادت کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ لِيَرْغَبِ الْحُسَيْن یہ حسین کا ذاتی فرض ہے۔ آپ نے فرمایا لِيَرْغَبِ الْمُؤْمِن۔ مطلب یہ ہے کہ ان حالات میں مومن کا یہ کام ہے کہ موت کو زندگی پر ترجیح دے۔ جب حق پر عمل نہ ہو رہا ہو اور باطل پر کوئی روک ٹوک نہ ہو تو ہر مسلمان پر بحیثیت مسلمان کے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اٹھ کھڑا ہو اور جامِ شہادت نوش کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

ان تین توجیہات میں سے ایک توجیہہ تو وہ ہے جو کوئی دشمنِ حسینؑ ہی کر سکتا ہے۔ ایک توجیہہ وہ ہے جو خود حسینؑ نے کی ہے یعنی یہ کہ وہ راہِ حق میں اٹھے تھے۔ ایک اور توجیہہ وہ ہے جو ان کے نادان دوست کرتے ہیں اور جو ان کے دشمنوں کی توجیہہ سے بھی زیادہ خطرناک، گمراہ کن اور حسینؑ کے مقصد و منشا سے بعید ترین ہے۔

رہا سوال کا دوسرا حصہ کہ ائمۂ دین نے مجالسِ غم برپا کرنے کی وصیت فرمائی، تو اس کی بھی وجہ وہی ہے جو ابھی میں نے عرض کی۔ امام حسینؑ نہ اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے شہید ہوئے، نہ امت کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر انہوں نے اپنی جانِ عزیز قربان کی۔ انہوں نے تو راہِ حق میں اپنی جان دی اور باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے، اس لیے ائمۂ اہلبیتؑ نے یہ چاہا کہ امام حسینؑ کا مکتبِ شہادت باقی اور ان کی تحریک زندہ رہے۔ شہادتِ حسینؑ چونکہ حق و باطل کے مقابلہ کی تحریک ہے اس لیے اسے ہمیشہ قائم و دائم رہنا چاہیے ورنہ امام حسینؑ کو اس سے کیا فائدہ کہ ہم روئیں یا نہ روئیں اور ہمیں

خود بھی اس سے کیا فائدہ کہ پہلے تو بیٹھ کر روئیں اور پھر کپڑے جھاڑ کر چل دیں۔ ائمہ تو یہ چاہتے تھے کہ قیامِ امام حسینؑ ایک تحریک اور ایک مشعل راہ کے طور پر ہمیشہ باقی رہے کیونکہ یہ حقیقت دوستی اور حقیقت طلبی کا ایک چراغ ہے اور حق طلبی، حریت اور آزادی کی پکار۔ اس حریت و آزادی کی تحریک اور ظلم و استبداد کے مقابلہ کی تعلیم کو باقی اور زندہ رہنا چاہیے[1] اس حکم کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ائمہ اطہار کے زمانے ہی میں انقلاب برپا ہو گیا اور خود امام حسینؑ کا نام ظلم کے خلاف انقلاب کا نعرہ بن گیا۔ بہت سے انقلابی شاعر پیدا ہو گئے۔ کمیت اسدی پیدا ہو گیا۔ دِعبل خزاعی وجود میں آگیا۔ جانتے ہو کمیت اسدی کون تھا؟ دِعبل خزاعی کون تھا؟ یہ دونوں روضہ خواں تھے لیکن میری طرح کے روضہ خواں نہیں۔ یہ مرثیہ گو شاعر تھے لیکن محتشم کاشانی وغیرہ کی طرح کے مرثیہ گو نہیں۔ دل چاہتا ہے کہ آپ کو کمیت اسدی، دِعبل خزاعی، ابن الرومی اور ابو فراس ہمدانی کے عربی اشعار سناؤں تاکہ آپ ان کا موازنہ محتشم کے اشعار سے کر سکیں جس کی تعریف و توصیف میں ہزاروں داستانیں زباں زد ہیں۔ مگر کہاں یہ اور کہاں وہ ـــ خاک کو آسمان سے کیا نسبت؟ ان شعراء کے اشعار حسینی تعلیمات کی عکاسی کرتے ہیں۔ صرف کمیت اسدی کے اشعار بنی امیہ کے لیے پورے ایک لشکر سے زیادہ ضرر رساں تھے۔ یہ شخص کون

---

[1] رہبر کبیر حضرت آیت اللہ خمینی نے فرمایا: "امام حسینؑ کی مجلس عزا منعقد کرنا اسلام کی بقا کا ذریعہ ہے۔ جو لوگ سید الشہداء کی مجالس کی مخالفت کرتے ہیں وہ اسلام کی حقیقت سے بالکل ناآشنا ہیں۔ عزاداریٔ سید الشہداء ہی نے آج تک اسلام کا تحفظ کیا ہے۔

تھا؟ ایک مرثیہ گو تھا۔ مگر ایسا مرثیہ گو نہیں کہ آکر چند الٹے سیدھے اشعار سنائے اور کچھ روپے جیب میں ڈال کر چل دیا۔ وہ شعر کہتا تھا تو دنیا کو ہلا دیتا تھا۔ دربارِ خلافت پر لرزہ طاری کر دیتا تھا۔

عبداللہ بن حسن بن علی المعروف بہ عبداللہ محض، کُمیت کے جاندار اشعار سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے کھیت کا قبالہ لا کر اسے پیش کر دیا۔ کُمیت نے کہا یہ تو کسی طرح ممکن نہیں کہ میں اسے قبول کر لوں۔ میں تو سید الشہداء کا مرثیہ خواں ہوں اور صرف رضائے الٰہی کی نیت سے مرثیہ کہتا ہوں۔ میں پیسے کمانے کے لیے شعر نہیں کہتا۔ عبداللہ کے بے حد اصرار پر اسے ماننا پڑا اور اس نے قبالہ لے لیا۔ کچھ دن بعد کُمیت عبداللہ بن حسن بن علی کے پاس آیا اور کہنے لگا میری آپ سے ایک درخواست ہے اگر آپ منظور کریں۔ عبداللہ نے کہا ضرور منظور کر لوں گا۔ مگر بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟ کُمیت نے کہا پہلے آپ پختہ وعدہ کیجیے پھر بتاؤں گا۔ غرض عبداللہ نے وعدہ کر لیا اور شاید قسم بھی کھالی۔ جیسے ہی انہوں نے وعدہ کیا، کُمیت نے قبالہ واپس کر دیا اور کہہ دیا کہ میں قبالہ نہیں لے سکتا۔

ایک اور موقع پر بنی ہاشم نے کچھ روپے جمع کر کے اسے دینے چاہے۔ ہر ممکن تدبیر کی مگر اسے نہ لینے تھے نہ لیے اور صاف کہہ دیا کہ یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں آپ سے روپے لوں۔

اس شخص نے اپنے اشعار اور اس نوع کی مرثیہ خوانی کی بدولت کیا کیا سختیاں نہیں جھیلیں، کیسی کیسی تکلیفیں نہیں اٹھائیں مگر اسکے پائے استقامت کو ذرا جنبش نہیں ہوئی۔ آخر کار اسے پکڑ کر حاکمِ کوفہ یوسف بن عمر ثقفی کے گھر لے گئے۔ اس نے آٹھ آدمی اس کے بدن پر حربے لگانے کے لیے مقرر کر دیے۔

جب اس کا دمِ آخر ہوا تو آخری الفاظ جو اس نے کہے یہ تھے :

اَللّٰھُمَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ! اَللّٰھُمَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ! خدایا اہلِ بیتِ پیغمبر، خدایا اہل بیت پیغمبر!

دِعبل بن علی خزاعی کو آپ جانتے ہیں؟ وہ کہتا تھا کہ میں پچاس سال سے خانہ بدوش ہوں۔ ان مرثیہ گو شعراء کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ کیونکر لگایا جاسکتا ہے کہ جن کی تربیت خود ائمہ علیہم السلام نے کی ہو۔ یہ صرف مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہیں۔ یہ مرثیہ کہتے تھے لیکن ان کے مرثیوں میں نوحہ اور بین نہیں تھا۔ وہ رزمیہ مرثیے کہتے تھے۔ ان کے قصیدے ایک انقلابی مفکّر کے مقالات کی طرح پراثر تھے۔ انہوں نے سید الشہداء امام حسینؑ کے زیرِ سایہ بنی امیہ اور بنی عباس پر ایسی سخت اور کڑی تنقید کی کہ انہیں خون کے آنسو رُلوا دیے۔

آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ متوکل نے حکم دیا تھا کہ امام حسینؑ کی قبر کو زیرِ آب کر دیا جائے اور کسی کو ان کی قبر پر جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ اگر کوئی وہاں جائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور اگر کوئی حسینؑ ابن علیؑ کا نام لے تو اسے سزا دی جائے۔ آپ ضرور سوچتے ہوں گے کہ متوکل کسی نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا تھا اور اس وجہ سے نام حسینؑ سے غیر معقول دشمنی اور بے سبب کینہ رکھتا تھا۔ نہیں جناب! یہ بات نہیں تھی۔ ائمہ اہلبیتؑ نے عزاداریِ حسینؑ کے بارے میں جو تاکید کی تھی اس کے اثر اور کُمیت اور دِعبل جیسے شاعروں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے امام حسینؑ کے نام میں وہ تاثیر پیدا ہو گئی تھی کہ ان کا نام ہی متوکل کے باپ کے زوال کا سبب بن گیا تھا۔ متوکل صاف دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ہر شاعر اس پر ایک لشکر سے زیادہ بھاری ہے اور حسینؑ

شہادت کے بعد بھی اس جیسے لوگوں کے منصوبے خاک میں ملانے کے لیے اتنے ہی کافی ہیں جتنے اپنی زندگی میں تھے۔ چونکہ ائمۂ اہلبیتؑ کی اس ہدایت اور اس حکم نے کہ سید الشہداءؑ کی یاد کو قائم رکھا جائے ان کے نام کو ظلم کے خلاف ایک نظریے اور ایک عقیدے کی شکل دے دی تھی اس لیے متوکل خوب سوچ سمجھ کر اس کے درپے تھا کہ اس نظریے اور اس عقیدے کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ امامؑ کی یاد کسی طرح باقی رہے۔ ورنہ بہ لحاظِ دیگر متوکل کافی ہوشیار آدمی تھا۔ تقدس کا لبادہ بھی اوڑھے ہوئے تھا اور ذاتی طور پر وہ امام حسینؑ کے بارے میں کسی نفسیاتی الجھاؤ کا بھی شکار نہیں تھا، مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ مرثیہ خوانی نے ایک ایسے نظریے کی شکل اختیار کر لی ہے کہ اب متوکل، متوکل نہیں رہ سکتا۔

اور بھی بہت سے قصے ہیں۔ اگر ان کو جمع کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سید الشہداءؑ کے مرثیہ گو جب تک تعلیماتِ ائمہ کی پیروی کرتے رہے، معاشرے میں ان کا کردار لائقِ صد تحسین رہا۔ ان باتوں کو اگر سمجھ لیا جائے اور ان کا سمجھنا ہے بھی ضروری، تو پھر عزاداریٔ حسینؑ سے صحیح استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ باوجود تمام کوتاہیوں کے سید الشہداءؑ کی نسبت آج بھی لوگوں کے جذبات و احساسات حقیقی اور پاک ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ جن کی نیت بری نہیں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ عزاداری کا مطلب غلط سمجھ لیا گیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بہتر ہے کہ اب اس فتنہ کو ختم ہی کر دیا جائے کیونکہ لوگ محض اس لیے گریہ و بکا کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے یہ سن رکھا ہے کہ اس طرح گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اگر یہ بات نہ ہو تو وہ قطعاً نہ روئیں لیکن یہ غلط فہمی ہے، حقیقت یہ نہیں۔ کسی کو لالچ دے کر رُلایا نہیں جا سکتا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو کچھ لوگوں کو جمع کر کے ان سے کہیے کہ کسی اور شخص کے لیے، مثلاً شاہ عباس کے لیے

ذرا آدھ گھنٹہ بیٹھ کر روئیں تو ہم ہر ایک کو ایک ہزار تومان دیں گے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ رونے کے لیے احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک آدمی متاثر نہ ہو اسے رونا نہیں آتا۔ آدمی اسی وقت رو سکتا ہے جب وہ غمگین ہو یا اس کے دل میں تڑپ ہو۔ سید الشہداء کی نسبت لوگوں کے جذبات واقعی ایک طرح سے حقیقی ہیں۔ لوگوں کو امام حسینؑ سے سچی محبت اور عقیدت ہے اور وہ دل سے ان کے لیے آنسو بہاتے ہیں۔ محرم اور صفر کے مہینوں میں ڈھیروں آنسو بہائے جاتے ہیں۔ جب تک غم و اندوہ نہ ہو، عشق و محبت نہ ہو، احساسات و جذبات نہ ہوں رونا نہیں آتا۔ یہ جذبات قیمتی اور بڑے قیمتی ہیں۔ مگر ابھی تک ہم نے ان جذبات سے جیسا کہ چاہیے ویسا فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہم کیوں ان جذبات سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے، یہ ایک الگ بات ہے۔

ہمارے پاس بہت سی چیزیں ہیں جن سے ہم فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہمارے یہاں دریائے کارون ہے جس سے ہم نے ابھی تک فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دریائے کارون کسی کام کا نہیں۔ صدیوں سے ہمارے یہاں زیر زمین تیل کے ذخائر تھے جن سے ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ ہمارے ملک میں ہزاروں معدنی ذخائر تھے اور ہیں جن سے ہم فائدہ نہیں اٹھا رہے۔

اگر ہمارا ملک چاہتا ہے کہ وہ خوشحال ہو اور جادۂ ترقی پر آگے بڑھے، یہاں تعلیمی اور صنعتی لحاظ سے پیشرفت ہو، حریت و آزادی کی راہ پر لگے تو بہترین اور آسان ترین طریقہ یہ ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ واحد طریقہ یہ ہے کہ سید الشہداء کے بارے میں لوگوں کے سچے جذبات سے استفادہ

کیا جائے[1]۔ یہ جذبات حقیقی ہیں اور ایک ہستی کے بارے میں ہیں جو قرار واقعی ان کی مستحق ہے اور جس کا پیش کردہ نظریہ بہت بلند اور عظیم ہے۔

ہم اپنے دین و مذہب کی ہدایت پر کیوں عمل نہ کریں۔ یہ تو بڑی اچھی ہدایت ہے جس پر ضرور عمل کرنا چاہیے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

بہرحال خطبہ و منبر کا جو ہمارے یہاں رواج ہے وہ نتیجہ ہے کربلا کے اندوہناک واقعہ کا اور اس کا کہ ائمۂ اطہار نے عزاداری سید الشہداء کی تاکید فرمائی ہے۔ یہ عزاداری ہی کی برکت ہے کہ مجالس میں فہمیدہ اور متدین اشخاص تقریریں کرتے ہیں۔ اب چونکہ سید الشہداء کے نام پر مجالس ترتیب دی جاتی ہیں اور انہی کے نام پر لوگ جمع ہوتے ہیں تو کیوں نہ ہم اس موقع سے ایک اور فائدہ اٹھائیں اور کیوں نہ ضمناً ایک اور اصول پر بھی عمل پیرا ہوں؟ وہ اصول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے۔ اس طرح امام حسینؑ کے دو منبر ہوں گے۔ ایک منبر تو مرثیہ خوانی اور مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مخالفت میں اظہار جذبات کا، جس کا اگر صحیح استعمال ہو تو وہ تمام عظیم آثار مرتب ہوں گے جن کا میں نے پیشتر ذکر کیا اور دوسرا منبر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا۔ ہمارے ملک میں رشد و ہدایت کا جو سلسلہ جاری ہے اور جو کچھ زبانی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے وہ سب حسینؑ بن علیؑ ہی کے مقدس نام کے طفیل سے ہے۔ یہ نہایت مناسب طریقہ اور بہت مستحسن رواج ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ منبر حسینؑ سے ضمناً کچھ نہ کچھ امر بالمعروف

---

[1] ایران میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے یہی نعرہ بلند کیا گیا تھا:
نہضت ما حسینی، رہبر ما خمینی۔

اور اصول و فروعِ دین کی تعلیم کا کام لیا جاتا ہے اور حسینؑ بن علیؑ کے بارے میں لوگوں کے جو حقیقی جذبات ہیں ان سے قدرے استفادہ کیا جاتا ہے۔

جس قدر لوگ حسینؑ بن علیؑ کے نام پر جمع ہو جاتے ہیں، اتنے کسی اور کے نام پر جمع نہیں ہوتے اس لیے یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ اس طرح کا ڈسٹورڈ موجود ہے۔ اب یہ کہ اس پر کس طرح عمل ہوتا ہے، یہ موقوف ہے ذاکر کی اپنی لیاقت اور قابلیت پر اور اس پر کہ وہ عقائد اور اصولِ دین بیان کر سکتا ہے، لوگوں کو پند و نصیحت کر سکتا ہے، حرام و حلال سمجھا سکتا ہے اور لوگوں کو ان کے دینی و دنیاوی مفاد سے آگاہ کر سکتا ہے۔ لوگ بہرحال حسینؑ بن علیؑ کی برکت سے سننے کے لیے تیار ہیں۔ اب یہ ذاکر پر ہے کہ اس میں ان حقائق کو بیان کرنے کی قابلیت ہے یا نہیں۔

جب یہ صورت ہے تو پھر یہ ضروری ہوا کہ اس معاملے پر مناسب غور و فکر کر کے ہر دو پہلو سے اس کی اصلاح کی تدبیر کی جائے، مرثیہ خوانی کے پہلو سے بھی اور لوگوں کی ہدایت و ارشاد کے پہلو سے بھی۔

مرثیہ خوانی میں اصلاح کی ضرورت

جہاں تک مرثیہ خوانی کا تعلق ہے مرثیہ خواں حضرات کو چاہیے کہ سید الشہداءؑ کی تحریک کی حقیقی روح اور اس کے مقصد کی طرف توجہ دیں اور ان احکامات و ہدایات کی علتِ غائی کو ذہن میں رکھیں جو ائمۂ اطہارؑ نے عزاداری کے بارے میں دی ہیں۔ چونکہ یہ ہدایات بلاوجہ نہیں دی گئیں اس لیے ان حضرات کو چاہیے کہ تحریکِ کربلا کے مقصد اور عزاداریٔ سید الشہداءؑ کے فلسفہ سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ یہ بات ایک دو بار نہیں، سینکڑوں بار بلکہ

ہمیشہ لوگوں کے کانوں میں پڑتی رہنی چاہیے اس لیے ضروری ہے کہ ذاکرین خود صاحب بصیرت ہوں۔ ان کی معلومات چند پیش پا افتادہ جنگ ناموں تک محدود نہ ہوں اور وہ خود ساختہ لسان الذاکرین اور صدر الواعظین نہ ہوں۔ یہ لوگ بہت سی باتیں ایک دوسرے سے سن کر نقل کرتے رہتے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ فلاں بات کہاں سے معلوم ہوئی تو جواب ملتا ہے کہ فلاں لسان الذاکرین نے بیان کی تھی۔ مطلب یہ کہ کسی کتاب میں نہیں دیکھی، محض ادھر اُدھر سے سنی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے لطیفے ہیں۔ اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں آج ان میں سے کچھ آپ کو سناتا جس سے آپ کو معلوم ہوتا کہ جھوٹ جو کوئی ایک شخص گھڑتا ہے کس تیزی سے پھیلتا ہے اور کس طرح ایک دوسرے سے ہوتا ہوا ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جا پہنچتا ہے۔ ضروری ہے کہ تاریخی واقعات صرف معتبر تاریخی کتابوں سے معتبر مؤرخین کے قول کے مطابق نقل کیے جائیں۔

ہمارے یہاں ایک مؤرخ ڈاکٹر آیتی ہیں (جامعہ تعلیمات اسلامی کی شائع کردہ کتاب "تاریخ عاشورا" کے مصنف ڈاکٹر محمد ابراہیم آیتی مرحوم) جن کو صدرِ اسلام کی تاریخ پر عبور ہے۔ میں جرأت کر کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاید پورے تہران بلکہ تمام ملک میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کو صدرِ اسلام کی تاریخ پر ایسا عبور ہو جیسا انہیں ہے۔ کوئی اور شخص ایسا نہیں ہے جسے تاریخ کے اس دور کے متعلق ایسی تفصیلی معلومات ہوں جیسی انہیں ہیں۔ ان صاحب کو اس دور سے متعلق تمام تاریخی کتابوں اور تاریخی جزئیات پر ایسا کامل عبور ہے کہ باید و شاید۔ مثلاً اگر آپ جنگ بدر کے بارے میں ان سے کچھ پوچھیں تو وہ اس جنگ میں شریک ایک ایک آدمی کے

بارے میں تفصیل بتا سکتے ہیں بلکہ بسا اوقات وہ یہ بھی بتا دیں گے کہ فلاں شخص جو جنگِ بدر میں شریک تھا اس کا باپ کون تھا، ماں کون تھی، اعزہ اور اقربا کون تھے وغیرہ۔ جو بات یہ صاحب کہتے ہیں سند ہوتی ہے لیکن اب اس کا کیا علاج کہ آپ اہل تہران کو تحقیقی بات سننے کی عادت ہی نہیں۔ ان صاحب کی تازہ ترین تصنیف جس کو یونیورسٹی نے شائع کیا ہے اندلس کی تاریخ کے بارے میں ہے اور اس کا نام بھی تاریخ اندلس ہے۔ اس میں تاریخ اسلام کے ایک ایسے حادثۂ فاجعہ کا ذکر ہے جس کے بارے میں ہم مسلمانوں اور خصوصاً ایرانیوں نے بڑی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ یہ کتاب پڑھنے کی ہے، ضرور پڑھیے۔

بہرحال ذکر یہ تھا کہ قیامِ حسینی کا مقصد اور عزاداری کا فلسفہ منبروں سے بار بار بیان ہوتے رہنا چاہیے تاکہ وہ فائدہ مرتب ہو اور وہ مقصد حاصل ہو جس کے لیے امام زین العابدینؑ، امام باقرؑ، امام صادقؑ اور امام کاظمؑ عزاداری کی تلقین کرتے رہے تھے تاکہ کمیت اور دعبل جیسے شاعر پیدا ہوں اور ان کے مرثیوں سے وہی پہلے جیسے نتائج برآمد ہوں۔ کوئی ایسا کام ہرگز نہیں کرنا چاہیے جس سے جذبات سرد پڑ جائیں بلکہ وہ کام کرنا چاہیے جس سے جذبات میں اور بھی شدت پیدا ہو۔ حق و صداقت سے لوگوں کی محبت اور باطل سے نفرت میں اضافہ ہو۔

مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہہ رہا ہے یہ ارے کون بہ اندازِ سروش
کہ بس امروز ہے امروز نہ فردا ہے نہ دوش

کس کی یا رب یہ صدا ہے کہ فضا ہے خاموش
میں حسینؑ ابن علیؑ بول رہا ہوں اے جوش
بخش دے آگ مرے سرد عزاداروں کو
ہاں! جگا ڈاب میں سوئی ہوئی تلواروں کو

اے قوم! وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
اسلام ہے پھر تیرِ حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے؟ اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ
تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ
مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابنِ علیؑ ہو[1]

حق و باطل کا معرکہ دنیا میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ موسیٰؑ اور فرعون ہمیشہ دنیا میں رہے ہیں، ابراہیمؑ اور نمرود ہمیشہ دنیا میں رہے ہیں۔ محمدؐ اور ابوجہل ہمیشہ رہے ہیں۔ علیؑ اور معاویہ دنیا میں ہمیشہ رہے ہیں حسینؑ اور یزید ہمیشہ رہے ہیں۔

موسیٰؑ و فرعون و شبّیرؑ و یزید
ایں دو قوّت از حیات آمد پدید
اقبالؒ

مقصد یہ نہیں ہے کہ ابراہیمؑ، موسیٰؑ، محمدؐ، علیؑ اور حسینؑ کے مرتبہ کے

---

[1] زیرِ بحث مضمون کی مناسبت سے ان اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے۔

لوگ ہمیشہ رہے ہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ حق اور باطل ہمیشہ برسرِ پیکار رہے ہیں۔ معاشرے کے سامنے ہمیشہ دوراستے رہے ہیں، ایک حق کا اور دوسرا باطل کا۔ یہ مجلس و مرثیہ کا ایک رُخ ہے۔

دوسرا رُخ ہے ارشاد و ہدایت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا۔ اس بارے میں کیا کرنا چاہیے اور اس پر عمل کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟

میرا خیال ہے کہ اس طریقہ کار پر عمل کرنا چاہیے جو خطبۂ جمعہ کے بارے میں ہمارے لیے تجویز کیا گیا ہے اور جس کے متعلق میں نے کل رات ایک روایت امام رضاؑ سے نقل کی تھی۔ یہ فرمان بہت جامع ہے لیکن ہمارے یہاں جمعہ کی نماز تو ہوتی نہیں کہ اس ہدایت پر جمعہ کے خطبہ میں عمل کیا جائے[1] اس لیے ان ہی خطبوں اور تقریروں میں اس پر عمل کیا جائے جو حسینؑ بن علیؑ کی برکت سے ہمارے یہاں رائج ہیں۔

واعظ کے فرائض

امام ثامن حضرت رضاؑ کی جو روایت میں نے کل رات بیان کی تھی،

---

[1] الحمد للہ شاہ ایران کی طاغوتی حکومت کے خاتمے کے بعد ایران کے ہر شہر میں نماز جمعہ کے فقید المثال اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ صرف تہران میں چالیس سے پچاس لاکھ افراد بیک وقت ایک جگہ جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ آج کے ایران میں دیواروں پر امام خمینی کا یہ جملہ لکھا نظر آتا ہے:

"نماز جمعہ یک نماز عادی نیست"

اس میں خطیب کے فرائض کو تین حقوق میں تقسیم کیا گیا ہے۔
پہلے حصے کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

انما جُعلت الخطبة یوم الجُمُعة لانّ الجمعة مشهد عام فاراد ان یکون للامیر سببٌ الی موعظتهم و ترغیبهم فی الطاعة و ترهیبهم من المعصیة[1] ۔ یعنی جمعہ کا دن ایسا ہے کہ سب لوگ جمع ہوتے ہیں اور مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ترتیب پاتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس موقع پر مسلمانوں کا رہنما وعظ کرے، اطاعت خداوندی کی ترغیب دے اور گناہوں سے متنبہ کرے۔

کوئی فردِ واحد بھی ایسا نہیں جسے وعظ ونصیحت کی حاجت نہ ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو کسی دوسرے سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ مگر وعظ ونصیحت سے کوئی بے نیاز نہیں کیونکہ کسی بات کا جاننا اور ہے، اور کسی مومن ومتقی واعظ کی تلقین سے اثر پذیر ہونا اور بات ہے۔ کہتے ہیں امام علیؑ اپنے اصحاب میں سے کسی سے فرماتے تھے کہ مجھے نصیحت کرو اور آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ سننے میں جو اثر ہے وہ جاننے میں نہیں۔

ضروری ہے کہ ہمیشہ کچھ لوگ جو اس کام کی صلاحیت واستعداد رکھتے ہوں، لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے رہیں، ان کو خدا کی یاد دلاتے رہیں، موت سے غافل نہ ہونے دیں اور انہیں گناہوں کے نتائج وعواقب سے ڈراتے رہیں۔ قبر وقیامت کا تذکرہ کرتے رہیں، لوگوں کو عدلِ الٰہی کی طرف متوجہ کرتے رہیں۔ یہ ضروری باتیں ہیں۔ معاشرہ کبھی ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ گزشتہ زمانے میں ہمارے یہاں اچھے اچھے واعظ ہوئے ہیں اور بحمد اللہ

اب بھی ہیں۔ جتنے زیادہ باصلاحیت اور جامع الشرائط واعظ ہوں بہتر ہے۔ خطبہ و منبر کے سلسلے میں اس کام کا ہونا بھی ضروری ہے۔

مفاد سے آگاہ کرنا

خطیب کے فرائض کا دوسرا حصّہ وہ ہے جس کے متعلق امام رضاؑ نے فرمایا:

وَتَوقِيفِهِمْ عَلىٰ مَا أرَادَ مِن مَصْلَحَةِ دِينِهِمْ وَدُنيَاهُمْ۔

یعنی خطیب کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو ان باتوں سے آگاہ کرے جو ان کے دینی اور دنیاوی مفاد میں ہوں اور یہ بتائے کہ موجودہ حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے اور ان کی دینی اور دنیاوی مصلحتوں کا اقتضاء کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا کام ہے اور پند و نصیحت اور عام وعظ سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ عام وعظ کی تو یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص اہل ایمان ہے، باعمل ہے، پُر خلوص ہے تو اگر اسے وعظ کے چند کلمات بھی کہنے آتے ہیں تو وہ وعظ کر سکتا ہے اور ایک حد تک اس کا وعظ مفید بھی ہوگا۔ اگر آدمی باعمل اور پُر خلوص ہو تو یہ بھی کافی ہے کہ بزرگوں کے کچھ اقوال ہی بیان کر دے لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ دینی اور دنیاوی مصالح عالیہ بیان کرے اور ان سے لوگوں کو آگاہ کرے تو یہ بڑا کٹھن کام ہے۔

اس کام میں دو دشواریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے لیے بڑی وسیع معلومات درکار ہیں، دوسرے خلوص بہت ضروری ہے تاکہ دین و دنیا کی جو مصلحتیں وہ سمجھتا ہے وہ صاف صاف دوسروں کو بتلا سکے۔

دینی اور معاشرتی معلومات

جہاں تک معلومات کا تعلق ہے تو دین کے اصول و مبانی سے کافی واقفیت ہونی چاہیے۔ اسلامی تعلیمات کی روح سے آگاہی ہونی چاہیے۔ اسلام کے ظاہر و باطن اور پوست و مغز میں تمیز کی صلاحیت ہونی چاہیے تاکہ وہ دینی مصلحتوں کو سمجھ سکے اور بیان کر سکے۔ صرف عام دینی معلومات اس مقصد کے لیے کافی نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے لیے معاشرے کو سمجھنا بھی ضروری ہے اور یہ جاننا بھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور موجودہ حالات میں اسلامی معاشرے کی مصلحت کا تقاضا کیا ہے تاکہ وہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور اسلامی معاشرے کے مفاد سے لوگوں کو روشناس کرا سکے۔

مقامِ افسوس ہے کہ وعظ کا یہ پہلو ہمارے ہاں کمزور ہے۔ واعظ بہت ہیں اور وعظ کے دوسرے پہلو کمزور نہیں یا کم از کم بہت کمزور نہیں مگر یہ پہلو بہت کمزور ہے کیونکہ مطالعہ کی بہت کمی ہے۔ امام رضاؑ کا ارشاد بہت زیادہ ارزش رکھتا ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ لوگوں کو دین و دنیا کی مصلحت سے آگاہ کرو۔ جس شخص کو صرف کسی خاص علم مثلاً فقہ، ادب یا فلسفہ کی چند کتابوں سے سروکار رہا ہو اور جس نے مدرسہ کے ایک کونے میں زندگی گزاری ہو وہ نہیں سمجھ سکتا کہ معاشرہ کی کیا حالت اور کیا ضرورت ہے۔ مدرسہ کے کونے میں بیٹھ کر کوئی معاشرے کے مفاد پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا علم بھی بہت ضروری ہے۔ یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ آئندہ کیا پیش آنے والا ہے اور معاشرے کو ان سے کس طرح نبٹنا چاہیے تاکہ کسی خطرہ کا سامنا نہ کرنا پڑے، بڑی تیز حس کی ضرورت ہے۔ پیش بینی کی صلاحیت کے بغیر ہدایت و رہنمائی کا کام ممکن نہیں۔

ہدایت کا کیا مطلب ؟

ہدایت کا کیا مطلب ہے ؟ ہدایت کے معنی ہیں رہنمائی۔ کوئی قافلہ کسی منزل کی طرف چلا جا رہا ہو تو راستے میں کسی سے پوچھتے ہیں کہ فلاں منزل کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس طرف سے جاؤ" یہ رہنمائی ہے۔ قافلہ کا رہنما کون ہو سکتا ہے ؟ صرف وہی جو سمجھتا ہو کہ قافلہ کس راستے پر ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ معاشرہ بھی ایک قافلہ ہی کی طرح ہے جو ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ قافلہ رواں دواں ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اس قافلہ کو کس سمت میں لے جایا جائے۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ موٹر ڈرائیور گاڑی چلا رہا ہے۔ اس حالت میں اسٹیرنگ وہیل اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ کہیں اسے گاڑی بند کرنے یا ٹھہرانے کی ضرورت ہوتی ہے اور کہیں گاڑی کی رفتار تیز کرنے اور بڑھانے کی۔ کسی جگہ اسٹیرنگ وہیل گھمانا پڑتا ہے، کہیں گیئر بدلنا ہوتا ہے اور کہیں بریک لگانا۔ یہ سب باتیں گاڑی کو صحیح چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ یہی حال معاشرے کا ہے۔ اسے بھی صحیح سمت میں چلانے کے لیے یہی سب کچھ کرنا پڑتا ہے کبھی اس کا رخ موڑنے کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی تیز چلانے کی اور کبھی ٹھہرانے کی۔ ہر کام وقتِ معین پر کرنا ہوتا ہے۔ اسے ہی معاشرے کی مصلحت کو سمجھنا کہتے ہیں۔ جو شخص یہ بات نہیں سمجھتا، وہ معاشرے کا ہادی اور رہبر نہیں بن سکتا اور نہ معاشرے کی مصلحت اور مفاد کے بارے میں گفتگو کر سکتا ہے۔

ہم معاشرے کے ہادی و رہبر اسی وقت بن سکتے ہیں جب ان سب باتوں کو سمجھیں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ کس وقت کیا کرنا چاہیے۔ کہاں معاشرے کو

بریک لگانا چاہیے اور کہاں اس کا رُخ موڑنا چاہیے۔ معاشرہ رواں دواں ہے پیچ و خم آتے رہتے ہیں کبھی کبھی معاشرتی موڑ آجاتے ہیں اور معاشرہ ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں بہت احتیاط سے گھومنا پڑتا ہے۔ ہمارا معاشرہ بھی اس وقت کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہے۔ ایک نیا تمدّن ابھر رہا ہے، نئے نئے نظریے اور نئے نئے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ ہمارے سامنے رکاوٹیں ہیں اور ہمیں بہت احتیاط سے چلنا ہے تاکہ ہم سہولت سے اور بے خطر اس موڑ سے گزر جائیں، اسٹیرنگ بہت آہستہ گھمانے کی ضرورت ہے تاکہ کوئی خطرناک صورتِ حال پیدا نہ ہو۔ سامنے دیوار ہے۔ اس دیوار سے بچ کر اپنے راستے پر جانا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آنکھیں بند کر کے اسی طرح چلتے رہیں جیسے پہلے چل رہے تھے۔ پہلے دیوار نہیں تھی، اب دیوار ہے۔ پہلے رکاوٹ نہیں تھی، اب رکاوٹ ہے۔ دریا آ گیا ہے۔ ہم پہاڑ کے درّہ پر پہنچ گئے ہیں۔ بہرحال یہ معاشرے کے رہنما کا کام ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرے کہ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے معاشرے کو کہاں مڑنا ہے اور کس نئے راستے پر چلنا ہے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رفتار کہاں بڑھانی ہے۔ آج دنیا ریس کورس بن گئی ہے۔ سب کوشش کر رہے ہیں کہ دوڑ جیت لیں اور آگے نکل جائیں۔ اس لیے رفتار تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ آج علم اور صنعت کی دوڑ ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ معاشرے کو حرکت میں لایا جائے تاکہ وہ دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ بیٹھے بیٹھے نکتہ چینی اور اعتراض کرنے کا نام رہنمائی اور ہدایت نہیں۔

ایک روز میں نے مدرسۂ مروی میں چند طلبہ سے اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہادیٔ قوم ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ہم لوگوں کو منع کرنے

ہی کا کام اختیار کر لیں۔ جب بھی کوئی بات ہو یہی کہے جائیں یہ مت کرو، وہ مت کرو اور اسی طرح لوگوں کو ایک مصیبت میں مبتلا کر دیں۔ کبھی کبھی لوگوں کی ہمت افزائی بھی کرنی چاہیے اور لوگوں کو کام پر آمادہ کرنا چاہیے۔ میں نے یہی موٹر گاڑی کی مثال دی اور کہا کہ ہمیں موٹر ڈرائیور کی طرح کبھی رفتار تیز کرنی چاہیے، کبھی اسٹیرنگ وہیل گھمانا چاہیے، کبھی بریک لگانا چاہیے اور کبھی تیز روشنی جلانی چاہیے۔ ہر موقع کا اپنا ایک اقتضاء ہے۔ پھر میں نے مذاقاً کہا کہ ہمیں ہمیشہ مسٹر بریک نہیں بنے رہنا چاہیے کہ ہر جگہ بس بریک ہی لگاتے رہیں محض بریک لگانا کافی نہیں ہے۔ کبھی اسٹیرنگ اور کبھی مسٹر گیئر بھی بن جانا چاہیے۔ اس پر ایک طالب علم نے کہا ہم تو کچھ بھی نہیں، صرف ریورس گیئر ہیں۔

بہر حال مختلف مواقع کو سمجھنے کے لیے وسیع علم اور زیادہ معلومات کی ضرورت ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ یہ سمجھے کہ مورچہ کہاں ہے، مورچہ پر قبضہ کرنا چاہیے۔ جو موقع ملے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

ان لربکم فی ایام دھرکم نفحات الا فتعرضوا لھا ـــ یعنی اللہ کی رحمت کی ہوائیں کبھی کبھی چلتی ہیں۔ اللہ کی رحمت کی مثال اس نسیمِ خوشگوار کی سی ہے جس کے متعلق معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی۔ چوکنے رہو تاکہ اس بادِ بہاری کے جھونکے جب کبھی آئیں ان سے فائدہ اٹھا سکو۔ اچھے اور مناسب موقع کی مثال زود گزر ہوا کے جھونکے کی سی ہے جو آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ اگر ہاتھ سے نکل جائے تو پھر اسے پکڑا نہیں جا سکتا۔ افسوس ہماری حالت پر کہ ہم موقع گنواتے رہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں مادہ پرست اور وہ گمراہ لوگ جنہوں نے اپنے مسلک پر مذہب کا لیبل لگا رکھا ہے کس قدر چالاک ہیں اور وہ ایک معاشرتی چوکی کے بعد دوسری چوکی اور ایک مورچہ کے بعد دوسرا مورچہ ہمارے ہاتھ سے چھینتے اور حسّاس مراکز پر قبضہ کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اپنا مقصد حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مگر ہمارا یہ حال ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ یہ مت کرو، وہ مت کرو، بریک لگاؤ بریک اور اس کارنامے پر بہت خوش اور مطمئن بھی ہیں۔

اس فقرہ سے وتوقیفهم علی ما اراد من مصلحة دینهم ودنیاهم مراد یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی دینی اور دنیادی مصلحتوں سے آگاہ کیا جائے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اس کے لیے دو شرطیں ہیں: علم اور خلوص۔ دین کے لیے بھی علم کی ضرورت ہے اور دنیا کے لیے بھی۔ واعظ کو دین شناس بھی ہونا چاہیے اور دنیا کے حالات حاضرہ اور معاشرتی واقعات تغیّرات اور موجودہ رجحانات سے بھی باخبر ہونا چاہیے۔

تا راہ بیں نباشی تو کے راہبر شوی!

خلوص

جہاں تک خلوص کا تعلق ہے حاجی نوری علیہ الرحمہ نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "لؤلؤ و مرجان" ہے۔ میں نے اس کتاب کا نام تو سنا تھا مگر پڑھی اسی سال ہے۔ یہ کتاب مرثیہ خوانی اور مرثیہ خواں حضرات کے بارے میں ہے۔ اس کا وعظ وخطبہ اور واعظ وخطیب حضرات سے کوئی تعلق نہیں۔

انہوں نے مرثیہ خوانی کے لیے دو شرطیں بیان کی ہیں۔ ایک اخلاص اور دوسرے صدق و راستگوئی۔ ان دونوں نکتوں پر بلند پایہ بحث کی ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جب میں نے یہ کتاب پڑھی تو مجھے بہت پسند آئی اور حاجی نوری سے میری عقیدت میں اضافہ ہو گیا۔ حاجی نوری محدث، بڑے پابند شریعت اور متقی شخص تھے اور مرحوم حاجی شیخ عباس قمیؒ اعلی اللہ مقامہ کے استاد تھے۔ خود شیخ عباس اور کئی دوسروں نے اعتراف کیا ہے کہ اتباع شریعت میں وہ اس درجہ تک نہیں پہنچ سکے جس درجہ پر ان کے استاد تھے۔ میں حاجی نوری کی اہم کتابیں پہلے پڑھ چکا تھا اور پہلے سے ان کا عقیدت مند تھا۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب کو پڑھنے کے بعد ان سے میری عقیدت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اس کتاب کے مقدمہ میں وہ ایک ہندوستانی عالم کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان صاحب نے مجھے خط لکھا اور اس میں ہندوستان میں مجلس و منبر کی جو صورت ہے اس کی شکایت کی اور لکھا کہ یہاں کے مرثیہ خواں زیادہ تر جھوٹے قصے بیان کرتے ہیں۔ حاجی نوری کہتے ہیں کہ ان ہندوستانی عالم نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس سلسلے میں ایک کتاب لکھوں تاکہ ان لوگوں کی دروغ گوئی کا سدِّ باب ہو سکے۔ حاجی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ شاید ان ہندوستانی عالم کا خیال تھا کہ صرف ہندوستان ہی کے روضہ خواں جھوٹے قصے سناتے ہیں۔ عراق و ایران میں ایسی دروغ گوئی نہیں ہوتی ہو گی اور وہاں صحیح و معتبر روایات ہی بیان ہوتی ہوں گی۔ انہیں معلوم نہیں کہ جھوٹ کی اشاعت کا مرکز تو یہیں ہے اور یہیں سے جھوٹے قصے ہندوستان پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد حاجی نوری کہتے ہیں کہ یہ سب قصور

علماء کا ہے جو تنقید اور اعتراض نہیں کرتے۔ اگر اہلِ علم سہل انگاری سے کام نہ لیتے، ان لوگوں کے صدق و کذب پر نگاہ رکھتے اور انہیں اکاذیب بیان کرنے سے روکتے تو خرابی اس حد تک نہ پہنچتی، یہ لوگ اس قدر جری اور بیباک نہ ہو سکتے۔ اس طرح کے واضح جھوٹ نہ پھیلا سکتے۔ مذہب حقّہ امامیہ اس قدر تضحیک و استہزاء کا ہدف نہ بنتا، مجالس اتنی بے رونق اور بے برکت نہ ہوتیں۔

بہرحال اپنے موضوع پر کتاب نہایت عمدہ ہے۔ تعجب ہے کہ اس کتاب کو وہ مقبولیت کیوں حاصل نہیں ہوئی جس کی یہ مستحق ہے۔ اس کتاب میں حاجی نوری نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی دو شرطیں بیان کی ہیں — اخلاص اور صدق — دونوں پر خوب بحث کی ہے۔ خصوصاً صدق و راستی اور جھوٹ کے اقسام پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اخبار اور احادیث پر کس قدر عبور ہے۔ میں نے اس موضوع پر اس قدر مفصل بحث اب تک کہیں اور نہیں دیکھی۔

اخلاص پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے اجرت اور معاوضہ لے کر روضہ خوانی پر گفتگو کی ہے۔ اخلاص سے مراد یہ ہے کہ کوئی عمل محض خدا کی رضا کے لیے کیا جائے۔ دوسری کوئی غرض شامل نہ ہو۔ غیر از خدا کے لیے عمل کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو یہی کہ روپیہ کمانا مقصود ہو۔ اور بھی چند اقسام ایسی ہیں جن کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

میری نظر میں ان کی اہمیت اجرت اور معاوضہ لینے سے بھی زیادہ ہے اور یہ اور بھی زیادہ خطرناک ہیں۔

کسی شخصیت کی دلالی

ان اقسام میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی شخص خطابت کی کرسی یا حسین ؑ ابن علی ؑ کے منبر پر بیٹھ کر دین کی تبلیغ کی بجائے کسی شخصیت کی دلالی شروع کر دے اور منبر کو شخصیتوں کی دلالی کا ذریعہ بنالے۔ بدقسمتی سے اس قسم کی چیز ہمارے معاشرے میں موجود ہے اور منبروں کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جس شخصیت کی دلالی کی جا رہی ہے وہ کوئی سیاسی شخصیت ہے یا روحانی شخصیت یا کوئی اور — دلال بانیٔ مجلس ہے، پیش نماز ہے یا پیش نماز سے اونچے درجہ کا کوئی شخص۔

ایسی حرکتیں منبر کی حیثیت اور مرتبہ سے فروتر اور اس کے خلاف ہیں۔ ویسے ظاہر ہے کہ جو شخص کوئی کام کرتا ہے وہ اس کی کوئی توجیہ اور تاویل تو گھڑ ہی لیتا ہے لیکن اس میں شک نہیں جن چیزوں نے منبرِ خطابت کو بے وقعت اور خراب کیا ہے ان میں سے ایک یہی دلالی ہے۔ اس کی وجہ سے منبر دلالی کی کرسی بن گیا ہے جسے اس آلودگی سے پاک کرنا ضروری ہے۔

لطیفہ گوئی

ایک اور بات یہ ہے کہ اگر وتوقیفهم علیٰ ما اراد من مصلحة دینهم و دنیاهم کے مصداق دینی اور دنیاوی مصالح کا بیان مقصود ہو تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مصلحت گوئی اور بات ہے اور دلچسپ باتیں کرنا اور چیز۔ مصلحت گوئی کے یہ معنی نہیں کہ ہم وہ کچھ کہیں جو لوگوں کو پسند آئے اور وہ ہماری واہ واہ کریں۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ لوگ اپنے زمانے کے پیغمبروں کے مخالف کیوں تھے؟ جو پیغمبر بھی آیا اس کی اتنے زیادہ لوگوں نے مخالفت کیوں کی؟ خود پیغمبروں کے زمانے میں ان کے معتقدین کی تعداد کم کیوں رہی؟ اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ انبیاء لوگوں کی کمزوریوں اور خرابیوں کے خلاف جدو جہد کرتے تھے اور ہم لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کمزوریوں اور برائیوں کی اصلاح کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان برائیوں اور کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ ہم ان کے نفع کی بات نہیں کرتے بلکہ بانیٔ مجلس اور سامعین کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان کی مصلحت کے مطابق بات نہیں کرتے بلکہ ان کے رجحان کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں قصہ محض جھوٹ ہے اور علاوہ ازیں لوگوں کو گمراہ کرے گا، مگر سامعین کو لبھانے کے لیے اس کو بیان کر دیتے ہیں۔

مثلاً باوجود اس کے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ حکایت من گھڑت ہے اور افسانہ طرازوں کے تخیل کی ایجاد ہے، پھر بھی نقل کرتے رہتے ہیں کہ ایک عیسائی جو بہت گنہگار تھا اور جس میں پنج عیب شرعی موجود تھے، کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ زائرین کربلا کے ساتھ ہو لیا۔ جب سب شہر کے دروازے پر پہنچے تو اور لوگ تو سواریوں سے اتر کر زیارت کے لیے روانہ ہو گئے البتہ عیسائی چونکہ غیر مسلم تھا دروازہ کے باہر ہی ٹھہر گیا اور سامان پر پڑ کر سو گیا۔ زائرین کے قافلے آتے جاتے رہے اور قافلوں کا غبار اڑ اڑ کر عیسائی کے بدن پر گرتا رہا۔ عیسائی نے خواب میں دیکھا کہ قیامت کا دن ہے اور لوگ گروہ در گروہ سید الشہداء سے نجات کا پروانہ لے رہے ہیں۔ فرشتے آتے ہیں اور ہر گروہ کا تعارف کراتے ہیں کہ یہ اشک افشانی کرتے تھے، یہ سینہ زنی کرتے تھے،

یہ زنجیروں سے ماتم کرتے تھے، یہ مجالس میں نیاز تقسیم کرتے تھے۔ یہ سبیلیں لگاتے تھے اور یہ فلاں کام کرتے تھے اور یہ فلاں کام۔

سید الشہداءؑ ہر گروہ کو پروانۂ نجات دیتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب لوگ نپٹ گئے اور فرشتوں کے سامنے کوئی شخص باقی نہ رہا۔ حضرت نے فرمایا، ایک شخص رہ گیا ہے، تم نے اسے پیش نہیں کیا۔ فرشتوں نے عرض کیا اب تو کوئی باقی نہیں۔ ہم فرشتے غلطی نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس پورا ریکارڈ موجود ہے۔ اس پر حضرت نے فرمایا واقعی تم سے غلطی ہوگئی۔ ایک عیسائی دروازے پر سو رہا تھا۔ جب زائروں کے قافلے گزرتے تھے۔ اس کے کپڑوں پر میرے زوّار کی گردِراہ جم جاتی تھی۔ جس کے کپڑوں یا بدن پر یہ غبار گرے وہ جہنم میں نہیں جا سکتا۔ ایک پروانۂ آزادی اس عیسائی کو بھی دے دیا جائے۔ اسی طرح کے اور قصّے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ سب عوام کی نادانی اور کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور لوگوں کی گمراہی اور بیجا افتخار میں اضافہ کرنا ہے۔ پیغمبر ایسا نہیں کرتے تھے۔ وہ لوگوں کی کمزوریوں کے خلاف جنگ کرتے تھے۔ لوگوں کے مفاد کا لحاظ رکھتے تھے لیکن ان کے رجحانات اور خوشنودی کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے میں بہت تھوڑے آدمیوں کو ان سے عقیدت پیدا ہوتی تھی۔

خلاصہ یہ کہ وتوفیقهم علیٰ ما اراد من مصلحة دينهم ودُنياهم کے فرمان کی تعمیل کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے: ایک علم اور معلومات کی اور دوسرے اخلاص کی۔

معلومات بھی دو طرح کی ضروری ہیں: ایک دین کے متعلق مکمل

معلومات، دوسرے دنیا کے حالات اور معاشرتی واقعات سے واقفیت۔
اخلاص کے سلسلے میں بھی میں نے دو باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی آج ہمیں ضرورت ہے۔ پہلی تو یہ کہ منبر کو دلالی کی کرسی نہ بننے دیا جائے اور دوسری یہ کہ معاشرے کی کمزوریوں کا مقابلہ کیا جائے، ان سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

خطیب کو چاہیے کہ لوگوں کو حالاتِ حاضرہ سے آگاہ کرے

امام رضاؑ کے فرمان کا تیسرا حصہ یہ تھا:

ویخبرھم بما ورد علیھم من الآفاق من الاحوال التی فیھا المضرۃ والمنفعۃ۔

یعنی دُور دراز کے مسلمان علاقوں سے جو اطلاعات ملیں اور وہاں جو اچھے بُرے واقعات پیش آئیں ان سے لوگوں کو آگاہ کرے۔

آفاق جمع ہے افق کی اور اس سے مراد ہیں دُور دراز کے مقامات، یعنی دور دراز کے مقامات پر اسلامی معاشرے کو جو واقعات پیش آئیں اور جن سے لوگ بے خبر ہوں خطیب کا فرض ہے کہ لوگوں کو ان کی اطلاع دے۔ خلاصہ یہ ہے کہ داخلی اور خارجی حالات بیان کرے۔ کیا آپ کو علم ہے کہ دنیا میں مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا آپ عالمِ اسلام کی خارجی سیاست سے واقف ہیں؟ یہ سب خطیب کو بتلانا چاہیے۔

مثلاً الجزائر[1] کا حادثہ جو پیش آیا ہے، اسی کو لیجیے۔ ہمارے خطیبوں کو چاہیے کہ اس حادثہ کی تازہ ترین خبریں لوگوں تک پہنچائیں۔ یہ نہیں کہ خطیب یا تو بالکل خاموش رہیں یا کچھ کہیں بھی تو اس وقت جب وہ بات ساری دنیا میں پھیل چکی ہو یا وہی باتیں دہرائیں جو ہر روز اخبارون میں چھپتی رہتی ہیں۔ ان کو چاہیے کہ اپنا خصوصی نمائندہ الجزائر بھیجیں اور تازہ ترین خبریں حاصل کریں، یا کم از کم تازہ ترین خبریں نیوز ایجنسیوں ہی سے حاصل کریں۔ فرانس کی سیکرٹ سروس کے گھناؤنے جرائم کو منظر عام پہ لائیں۔ واضح رہے کہ فرانس کی سیکرٹ سروس یزید کی فوج کی مثل ہے۔ جب یزیدی لشکر کے مظالم کو بیان کیا جاتا ہے تو ان کے مظالم کو کیوں نہ بیان کیا جائے۔ دونوں میں کیا فرق ہے۔ یہ بھی شقاوت میں ان سے کچھ کم نہیں۔ انھوں نے بھی کچھ کسر نہیں چھوڑی۔ عورتوں اور بچوں تک کو نہیں چھوڑا۔ کتابوں اور کتب خانوں کو انھوں نے آگ لگا دی۔ آبادیوں کو ویران کر دیا، کھیتوں کو تباہ کر دیا۔ نسل کشی کے یہ مرتکب ہوئے[2]۔ ان کا بھی وہی حال ہے جیسا کہ قرآن میں بعض لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے:

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ۔

(سورۂ بقرہ : آیت ۲۰۵)

---

[1] یہ تقریر اس وقت کی گئی جب الجزائر میں جنگِ آزادی جاری تھی۔

[2] یہی کچھ حال میں اسرائیل نے صابرہ اور شتیلا کے فلسطینی کیمپوں میں کیا اور یہی کچھ روس افغانستان میں کر رہا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں امریکی امپیریلزم بھی ایسے ہی گھناؤنے جرائم کی مرتکب ہو رہی ہے۔

امام حسینؑ کا واقعہ جس کی یاد قائم رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے درحقیقت ہمارے لیے ایک تنبیہہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اسلام پر کیا آفت آئی تھی۔ اس سانحہ کی یاد کو تازہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم ہمیشہ ہوشیار رہیں کہ مبادا اسلام پر کوئی اور ایسی مصیبت نہ آجائے لیکن اس کے برعکس ہم نے کوئی ایسا سبق نہیں سیکھا۔ الجزائر کے حادثہ سے بھی بڑی مصیبتیں اسلام پر گزر گئیں لیکن ہم میں سے کسی نے اُف تک نہ کی۔

فاجعۂ اَندلُس

کچھ مدّت قبل میں نے ایک بڑے عالم سے، جو مرجع تقلید بھی ہیں، سانحۂ اَندلُس کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ اثنائے گفتگو میں میں نے ان سے کہا کہ پانچ سو سال قبل اسلام اور مسلمانوں پر ایک بہت بڑا سانحہ گزر گیا۔ (اس سانحہ کا اختتام ۹۹۸ھ میں ہوا) اسلامی تمدّن کا ایک بڑا مرکز ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ سب آدمی مارے گئے یا جلا دیے گئے۔ ایک جگہ عیسائیوں نے تین ہزار آدمیوں کو زندہ جلا دیا۔ دو لاکھ مسلمان جو ملک سے ہجرت کر جانا چاہتے تھے اور خود عیسائیوں نے انہیں ملک چھوڑنے کی اجازت دی تھی ان میں سے ایک لاکھ راستے ہی میں مارے گئے (سترھویں صدی کا مشہور فرانسیسی مؤرخ) گسٹاو لوبون خود عیسائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عیسائیوں نے جو مظالم اسپین میں مسلمانوں پر کیے ان کی دنیا کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ اتنے بڑے مظالم واقع ہوئے لیکن دوسری طرف آپ دیکھیں گے کہ اس وقت سے لے کر آج تک جتنی کتابیں ایرانیوں نے لکھیں، خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی میں، کسی فردِ واحد نے بھی کسی کتاب میں اس

حادثہ کا جو عالم اسلام پر گزر گیا، نام تک نہیں لیا۔ کسی ہمدردی یا اظہار افسوس کا تو ذکر ہی کیا کوئی نہیں تھا جو اس حادثہ کی اطلاع عوام تک پہنچاتا۔ بظاہر پہلی کتاب جو ایران میں تاریخ اندلس پر لکھی گئی وہ حال ہی میں آقائے آیتی نے تالیف کی ہے اور یونیورسٹی نے اسے شائع کیا ہے۔

دنیا کے مختلف حصّوں میں

برادرانِ اسلام

اس طرح کے واقعات کا تذکرہ منبروں سے ہونا اور ان کی اطلاع عوام تک پہنچانا ضروری ہے۔ آیا اب بھی آپ جانتے ہیں کہ ان شہروں میں جو پہلے ایران کا حصہ تھے اور اب کمیونسٹ ملکوں میں شامل ہیں، وہاں مسلمان بھائیوں پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ مشرقی ترکستان کے مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ کیا آپ کو فلسطینی مہاجرین کے متعلق کچھ معلوم ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ آج اسرائیل عالمِ اسلام کے لیے کتنا بڑا خطرہ ہے؟

آجکل عالمِ اسلام دو بڑے خطروں سے دوچار ہے۔ الجزائر کا قضیہ اپنی اہمیت کے باوجود مقامی نوعیت کا ہے لیکن ان دو خطروں کی نوعیت عمومی ہے اور عالمِ اسلام کی خارجی سیاست میں ان کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ ان دو خطروں میں سے ایک کمیونزم ہے، دوسرا صہیونزم۔ ایک کفرِ صریح ہے، دوسرا کفرِ نفاق۔ ان دونوں نے تمام اسلامی ملکوں میں اپنا جاسوسی کا جال پھیلا رکھا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ہر سال کتنے ملین ڈالر اس کارِ بد پر صرف کیے

جاتے ہیں۔ یہ دونوں اسلام کی شہ رگ کو منقطع کرنے کے درپے ہیں اور قینچی کے دو پھلوں کی طرح اسلام کی جڑ کاٹنے کی کوشش میں مصروف ہیں مسلمانوں کو چاہیے کہ ان دونوں خطروں سے پوری طرح ہوشیار اور چوکنّا رہیں۔ آپ سنتے رہتے ہیں کہ فلاں عرب ملک کے فلاں عرب ملک کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہیں۔ شام اور مصر میں کشیدگی ہے۔ اردن کے شام کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں۔ سعودی عرب کے حالات ٹھیک نہیں۔ یاد رکھیے کہ ان سب جھگڑوں میں اسرائیل کا ہاتھ ہے۔

اس خطرہ سے لوگوں کو آگاہ کرنا ضروری ہے لیکن کون آگاہ کرے؟ حکومت؟ حکومت کو تو اپنے فرائض کا ہی ہوش نہیں۔ سیاسی پارٹیاں؟ سیاسی پارٹیوں کے آئین میں ایسی کوئی چیز شامل نہیں۔ اس خطرہ سے عوام کو آگاہ کرنا خطیبوں کا فرض ہے۔ انہیں اپنا فرض ادا کرنا چاہیے کیونکہ وہ اسلام کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

خطیب اسلام کا ترجمان ہے

ہر حکومت اور ہر بڑے ادارے کا ایک ترجمان ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج سرکاری ترجمان نے یہ کہا ہے اور وہ کہا ہے۔ دین اسلام کا بھی ترجمان ہونا چاہیے۔ اسلام کے ترجمان خطیب اور اہلِ منبر ہیں۔ امام رضاؑ نے فرمایا:

ویخبرھم بما ورد علیھم من الآفاق۔

من الاحوال التی فیھا المضرّۃ و المنفعۃ

دور دراز کے علاقوں کے وہ حالات جو عوام کو معلوم نہ ہوں ان کو بتلائے جائیں۔ امام رضاؑ نے یہ بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ امپیریلسٹوں، کمیونسٹوں اور یہودیوں کی سرگرمیاں کیا ہیں اور ان سرگرمیوں کا بیان کرنا واجب ہے۔

منبرِ حسینؑ سے اگر یہ سب باتیں بیان کی جائیں تو اسے واقعی محافظِ اسلام کہا جا سکتا ہے۔ یہی عزاداریٔ حسینؑ کا فلسفہ ہے۔ ورنہ امام عالیمقام کو ہمارے رونے سے کیا فائدہ؟ انہیں ہمارے اور آپ کے رونے کی کیا ضرورت؟ امام حسینؑ تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کا نام اور ان کا نظریہ زندہ رہے۔ ان کے نظریہ کے تحت ہم باطل سے نبرد آزما ہوں۔ کمیونزم کے خلاف جنگ کریں، سامراجی اور صہیونی سازشوں کا قلع قمع کریں اور بے انصافی، بدعنوانی، قمار بازی اور مسکرات کے خلاف جدوجہد کریں۔

اشھد انّک قد اقمتَ الصّلوٰۃ و اٰتیتَ الزکوٰۃ و امرتَ بالمعروف و نھیتَ عن المنکر و جاھدت فی اللّٰہ حقّ جھادہٖ۔ کاش ایک بار پھر حسینؑ کا ذکر ان کا نام اور ان کی یاد ہمیں جنبش میں لائے! یالیتنا کُنّا معکم فنفوزَ فوزاً عظیماً ایک ایسے سانحہ میں شرکت کی آرزو کہ جس کو اب چودہ سو سال گزر چکے ہیں بظاہر اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

یہ سب باتیں اس لیے ہیں کہ ہم مستعد اور متعہد رہیں اور سید الشہداء کو ایک نظریے کی صورت میں زندہ رکھیں۔ شہیدِ کربلا نہیں رہے مگر ان کا مکتب زندہ ہے اور ہمیں حسینی پرچم تلے ہی جدّوجہد کرنی ہے اور راہِ حق میں قدم آگے بڑھانا ہے۔

اے حاملانِ آتشِ سوزاں، بڑھے چلو
اے پیروانِ شاہِ شہیداں، بڑھے چلو

اے فاتحانِ صرصر و طوفاں، بڑھے چلو
اے صاحبانِ ہمتِ یزداں، بڑھے چلو

تلوار شمرِ عصر کے سینے میں بھونک دو
ہاں جھونک دو، یزید کو دوزخ میں جھونک دو

تاریخِ عاشورا

اس کتاب میں ڈاکٹر ابراہیم آیتی نے بڑے اچھوتے انداز میں حضرت سیّد الشہداء کے قیام و انقلاب کا فلسفہ بیان کیا ہے۔

قیمت ۲۵/= روپے

جامعہ تعلیمات اسلامی

بنائے کربلا

ڈاکٹر جعفر شہیدی نے اپنی اس تازہ ترین تصنیف
میں تحریکِ کربلا کے اسباب و وجوہات سے بحث
کرتے ہوئے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

قیمت ۲۵/ روپے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝
نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ۝

اسلام کے حقیقی نظریات اور معارف کے اِدراک اور آپ کے علمی، دینی اور روحانی ذوق کی تسکین کے لئے

عالمِ اسلام کے جیّد عالموں اور دانشوروں کی تحقیقی کاوشوں پر مبنی اور اپنے مواد کی صحت، دیدہ زیب کتابت، عمدہ کاغذ اور خوبصورت طباعت سے مزیّن ہونے کی بنا پر جامعۂ تعلیماتِ اسلامی کی قابلِ قدر مندرجہ ذیل مطبوعات کتابوں کی دنیا میں یقیناً گرانبہا اضافہ ہیں۔

اسلام دینِ فطرت	جمعی از دانشمندان	۲۵/- روپے
اسلام دینِ معاشرت	جمعی از دانشمندان	۲۵/- "
اسلام دین معرفت	محمد صحفی	۵۰/- "
اسلام دینِ حکمت	محمد بہشتی۔ جواد باہنر	۱۰۰/- "
فلسفۂ معجزہ	آیت اللہ خوئی	۱۵/- "
فلسفۂ شہادت	مرتضیٰ مطہری	۱۰/- "
فلسفۂ ولایت	مرتضیٰ مطہری	۱۵/- "
فلسفۂ احکام	ناصر مکارم/جعفر سبحانی	۴۰/- "
فلسفۂ حجاب	مرتضیٰ مطہری	۱۵/- "
تاریخِ عاشورا	محمد ابراہیم آیتی	۲۰/- "
توضیح المسائل	آیت اللہ خوئی	۲۰/- "
پاسدارانِ اسلام	محمد حسین طباطبائی	۳۰/- "
مکتبِ اسلام	محمد حسین طباطبائی	۳۰/- روپے
مکتبِ رسول	محسن قرائتی	زیرِ طبع
مکتبِ تشیّع	محمد رضا مظفر	۲۰/- "
انتظارِ امام	محمد باقر صدر	۸/- "
آخری فتح	مرتضیٰ مطہری	۸/- "
سخن	مرتضیٰ مطہری	زیرِ طبع
فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَة	محمدی رے شہری	۵/- "
تعلیماتِ اسلامی	جمعی از دانشمندان	۲۴/- "
مردِ انقلاب	مصطفیٰ زمانی	۱۵/- "
بُت شکن	مصطفیٰ زمانی	۱۵/- "
گفتارِ عاشورا	جمعی از دانشمندان	۱۸/- "
جہادِ اکبر	امام خمینی	زیرِ طبع

اس کے علاوہ بچّوں کے لیے قرآنی قاعدے اور دینی قصّے بھی دستیاب ہیں

جامعۂ تعلیماتِ اسلامی پاکستان